تعلیم کے بنیادی مباحث

ڈاکٹر وحید قریشی

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد

تعلیم کے بنیادی مباحث

ڈاکٹر وحید قریشی

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز۔ اسلام آباد

کتاب : تعلیم کے بنیادی مباحث

مصنف : ڈاکٹر وحید قریشی

زیر اہتمام : انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز
بلاک ۱۹، مرکز ایف سیون، اسلام آباد
فون: ۲۷۲۵۹۰-۹۲ فیکس: ۸۲۴۷۰۴

طابع : شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

تقسیم کنندہ : بک ٹریڈرز، (پرائیویٹ) لمیٹڈ
مرکز ایف سیون، اسلام آباد
فون: ۸۲۳۰۹۴ فیکس: ۸۲۴۷۰۴

آئی ایس بی این : ۹۶۹-۴۴۸-۰۶۱-۲

قیمت

ترتیب

پیش لفظ

اہل نظر کے نزدیک ہمارے سماجی انحطاط اور قومی بحران کا بڑا سبب تعلیمی پسماندگی ہے۔ نظریاتی، تحقیقی اور عملی سطح پر تعلیمی کم مائگی اس منظر نامے کی شہ سرخیاں ہیں۔

محترم ڈاکٹر وحید قریشی جو ایک مشفق استاد، کہنہ مشق محقق، راست فکر ماہر اقبالیات، مزاج شناس غالب اور دل بے تاب رکھنے والے ماہر تعلیم ہیں۔ انہوں نے پاکستانی نظام تعلیم کو سنوارنے اور سنبھالا دینے کے لیے مختلف مواقع پر قیمتی آراء تحریر کیں، اور پیش آمدہ صورت حال کا جائزہ لیا۔

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کی خواہش پر انہوں نے تعلیم کے موضوع پر اپنی تحریروں کا انتخاب مرتب کرنے کی اجازت دے دی۔ یہ انتخاب جناب سلیم منصور خالد نے مرتب کیا ہے۔ یہ مقالات گہرے غور و فکر اور عملی اقدام کا تقاضا کرتے ہیں۔ امید ہے کہ متعلقہ ادارے ان سے استفادہ کریں گے۔

خالد رحمٰن

مقدمہ

پاکستان میں سیاسی اور سماجی اعتبار سے پچھلے پچاس برس میں حالات دگرگوں چلے آئے ہیں۔ اس سے عدم اطمینان اور عدم استحکام کے کئی پہلو نکلتے ہیں۔

○

اصلاح تعلیم کی جملہ کوششیں بے یقینی اور تذبذب کے ریگ زار میں گم ہوتی رہی ہیں۔ معاشرہ ایسے منافقانہ انداز زیست کا عادی ہو چکا ہے، جس سے فکر و عمل میں فاصلے بڑھ گئے ہیں۔ ناقص منصوبہ بندیوں، ادھورے عملی اقدامات اور منافقانہ طرزِ عمل نے ہمیں ایک ایسے راستے پر ڈال دیا ہے، جس میں افتراق و انتشار، زوال و انقراض اور بے دلی و بے عملی کے سوا کوئی نشان راہ نہیں ملتا۔ قومیں جب نصب العین سے غافل ہو جاتی ہیں تو خوش نصیبی کے دروازے ان پر بند ہو جاتے ہیں۔ جب سیاسی حالات کی سنگینی، اقتصادی اقدامات کے نتائج پر اثر انداز ہوتی ہے تو سماجی زندگی بے جہتی کا شکار ہو کر تہ و بالا ہو جاتی ہے۔ ایسے میں اصلاح احوال کے لیے کئی جہتوں سے پیش قدمی کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اگر ارباب حکومت حالات کی سنگینی اور معاملات کی پیچیدگی کو سمجھنے سے انکار کر دیں اور زندگی کے ہر عمل کو ایک سادہ اکائی کے طور پر قیاس کرنے لگیں تو پھر امور سلطنت کا سنبھلنا مشکل ہو جاتا ہے۔

سیاست دان محض ایک عمومی تاثر کے بل بوتے پر اپنی راہ نکالنے کی کوشش میں لگے ہیں۔ حکومت کے کارندے بھی اسی سوچ کے داعی ہیں۔ اس لیے اصلاح کی کوششیں کسی نتیجہ خیز ثمر سے محروم ہو گئی ہیں۔ مغرب پرستی نے ہمیں اپنے حالات سے غافل کر رکھا ہے۔ تعلیمی میدان میں بھی یہی ذہنیت کار فرما ہے۔ ہم گزشتہ چالیس پینتالیس برس سے قوم پر نئے نئے تعلیمی اصلاحی پروگراموں کی آری چلا رہے ہیں۔ آئیڈیل ازم ہمیں دنیا کی ہر بات کے بارے میں فلسفیانہ سوچ پر اکساتی ہے اور ہم پے در پے تعلیمی کمیشن بٹھاتے اور تعلیمی پروگرام بناتے چلے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف ہماری تعلیمی تجاویز نہایت عمدہ فلسفیانہ مباحث کا قیمتی خزانہ ہیں، لیکن دوسری طرف ان کا رشتہ گردوپیش کی زندگی سے استوار نہیں ہے۔

امریکہ، برطانیہ اور روس کے تعلیمی تجربات ہم اپنی نسل پر برابر آزماتے چلے جاتے ہیں۔ یہ دیکھے بغیر کہ اس مٹی میں یہ پود اگ بھی سکتا ہے یا نہیں۔ مغرب سے ہمیں علم کی روشنی ضرور حاصل کرنی چاہیے۔ سائنسی علوم کی بے پناہ پیش رفت میں مغرب کا کردار بہت اہم اور قابل ستائش ہے۔ اس سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے اور اخذ و اکتساب کے دریچے کھلے رکھنے لازم ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مغرب سے آئی ہوئی ہر چیز کو ہم آمنا و صدقنا کہیں۔

مادہ پرست معاشرے کا نصب العین ہمارے معاشرے سے مختلف ہے۔ اس لیے ہمیں مغربی علوم سے استفادے کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھنا ہوگا، کہ بعض چیزیں ہماری معاشرتی زندگی میں جذب ہو سکتی ہیں اور بعض نہیں۔ مشرق و مغرب کی سماجی زندگی ایک ماضی بھی رکھتی ہے اور اس کا تعلق ان کے حال کے ساتھ بھی ہے۔ ماضی، حال، مستقبل ایک اکائی ہے، جس میں عصری ضرورتوں اور نئے نئے علوم کی ضرورت ہمیشہ رہے گی۔ تاہم انجذاب کا عمل ایک داخلی عمل بھی ہے جس میں باہر سے لائی ہوئی ہر چیز سموئی نہیں جا سکتی۔ اس کے کچھ اجزا کو آہستہ آہستہ اور فطری طریقے سے پیوندِ مزاج ہونا ہے۔

○

ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ ہم خود اپنے حالات کا تجزیہ نہیں کر پاتے یا تجزیے بھی

دساور سے برآمد کرتے ہیں۔ چند برس ہوئے ایک ایسے دانش ور سے سابقہ پڑا، جن کے پیش نظر طالب علموں کی ہڑتالوں اور مظاہروں کا تجزیہ کرنا تھا۔ انہوں نے اپنی تحقیقات کا یہ نچوڑ پیش کیا، کہ ہمارے ہاں جو کچھ ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے، وہ اس صورت حال کا نتیجہ ہے۔ کہ دنیا کے کونے کونے میں طالب علموں میں بیداری کی لہر چل چکی ہے۔ ظاہر ہے ان کا یہ خیال ایک سطحی سوچ کا حامل ہے۔ وہ صاحب یہ بھول گئے کہ ہر مسئلے کے تجزیے میں کچھ فوری اسباب ہوتے ہیں، اور کچھ دور رس اسباب۔ کچھ کا تعلق اس کی معاشرتی زندگی سے بھی ہوتا ہے۔ ظاہری مشابہتوں کی دلکشی کے باوجود کچھ خرابیاں خود ہمارے سماجی حالات کی پیدا کردہ ہیں، جن کو نگاہ میں رکھنا لازم ہے۔

مستعار فلسفہ میں اچھی باتیں بھی ہوں گی، لیکن ان کے اطلاقات کے لیے اپنے معاشرے کے احوال و ظروف اور آدرشوں کو دیکھنا بھی ضروری ہے۔ اب تک کی تعلیمی رپورٹوں میں بڑی خرابی یہی رہی ہے کہ ہمارے اہل حل و عقد تعلیمی نظام کو پہلے برطانیہ سے، اور پھر امریکہ سے اخذ کر کے پاکستان کے گملوں میں لگانے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ اس عمل میں وہ اپنے ملکی حالات کی سامنے نظر آنے والی صورت حال کو یک سر فراموش کیے ہوئے ہیں۔ اس نامسعود کاوش کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک طویل مدت گزر جانے کے باوجود ہمارے مسائل جوں کے توں موجود ہیں۔

پاکستان ایک سیکولر ریاست نہیں ہے۔ اس کے نظام تعلیم کو اس کے نصب العین اور امنگوں سے منسلک ہونا چاہیے۔

مغربی نظام تعلیم کے دنیاداری کے پہلو کو بدل کر ہمیں اسے اپنے آدرش سے مربوط کرنا ہوگا۔ اپنے ملکی حالات کی روشنی میں اخذ و انجذاب سے کام لے کر ہی اگلا قدم ممکن ہوگا۔ ہمارا نصب العین ایک فلسفیانہ دستاویز کی صورت میں تو بلاشبہ ان جملہ تعلیمی رپورٹوں میں درج ہے، لیکن اس کے نظام تعلیم کے تار و پود میں سمو کر نہیں دکھایا گیا۔ وہ خارج از آہنگ اور زاید از کار مبحث بن کر شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم بار بار منافقت کے گڑھے میں گرتے ہیں اور سبق حاصل نہیں کرتے۔ ہم آج بھی سیکولر پاکستان اور نظریاتی پاکستان کے درمیان ایک منافقانہ طرز فکر اپنائے ہوئے ہیں۔ ہر تعلیمی رپورٹ کی اصل روح سیکولر ہے اور اس میں اسلام کو محض ایک آرائشی محراب کے طور پر سجا کر لگا دیا گیا ہے۔

پاکستان اسلامی ریاست ہے۔ اس نقطۂ نظر سے ان تعلیمی سفارشات کو دیکھیں تو ان میں نظام تعلیم کے اصل دھارے کو اساسی طور پر سیکولر ہی رکھا گیا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ متوازی دھارے میں بعض افراد کے لیے کچھ ملازمتوں کا بندوبست بھی کیا گیا ہے۔ پچھلی چوتھائی صدی سے جملہ مضامین تعلیم کو اسلام کے رنگ روغن سے آزاد رکھ کر، اسلامیات کو الگ مضمون بنا کر اسلام کو اس ایک مضمون میں قید کر دیا گیا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ جملہ نصابی مضامین میں اسلام روح کے طور پر ہر جگہ جاری و ساری رہتا، لیکن ایسا نہیں کیا گیا بلکہ اسلامیات کو الگ مضمون بنا کر اسے کیپسول میں بند کر دیا گیا ہے۔ یہی خرابی آج تک ہمارے تعلیمی نظام میں برقرار ہے۔ تعلیمی اداروں کی تعداد بڑھنے سے اس کا نقشہ اور زیادہ بھیانک اور نقصان دہ ہوتا چلا گیا ہے۔

○

مغربی تعلیمی نظام کی تین بڑی خرابیاں نمایاں ہیں:

(۱) تعلیم صرف تعلیم ہو کر رہ گئی ہے، تربیت اس کا لازمی حصہ نہیں رہی۔ سرسید احمد خان مرحوم کے دور سے اس دوئی کا آغاز ہوا تھا، کہ تعلیم اساتذہ کے اور تربیت والدین کے حصے میں آئی تھی۔ معاشرتی حالات کے زیر اثر اس تضاد نے رفتہ رفتہ خوفناک صورت اختیار کر لی ہے، اور اب معاشرے میں تعلیم تو ہے، مگر تربیت غائب ہو چکی ہے۔ کسی تعلیمی پالیسی نے بھی اس امر خاص کی طرف توجہ نہیں کی۔

(۲) یکساں نظام تعلیم ہماری اولین ضرورت ہے، جس کے بغیر ملکی وحدت ممکن نہیں۔ برطانوی دور میں دینی مدرسوں کا نظام اور اس کے مقابلے میں جدید نظام تعلیم تھا۔ اس دورنگی کی خرابیاں اپنی جگہ پر تھیں۔ دینی مدارس کو جدید طرز کے مدرسوں کے نظام سے آج تک مربوط نہیں کیا گیا، جس سے ملک کے باشندے آج بھی دو قسم کے شہریوں میں منقسم ہیں اور ایک دوسرے کی بات تک نہیں سمجھتے۔ خود انگریزی نظام تعلیم، کئی ذیلی نظاموں میں بٹ کر ملی وحدت کو مزید پارہ پارہ کر رہا ہے۔ اس میں سب سے زیادہ مہلک مسئلہ معاشرے کے داخلی تضادات کا ہے۔ معاشرہ طبقاتی ہو کر رہ گیا ہے۔ صنعتی ترقی سے امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہو چکا ہے۔ متوسط طبقہ سمٹ گیا ہے اور طاقت کا اصل سرچشمہ امیر طبقہ

بن چکا ہے۔ کاروبار حکومت متوسط طبقے کے ہاتھ سے نکل کر امیر طبقے کے ہاتھ میں جا چکا ہے۔ تعلیم کے حوالے سے ملک میں دو واضح طبقے بن چکے ہیں، ایک امیر طبقہ اور دوسرا غریب طبقہ۔ جدید نظام تعلیم بھی دو خانوں میں بٹ چکا ہے۔ امیروں کا نظام تعلیم الگ اور غریبوں کا جداگانہ ہے۔ اس تفاوت نے معاشرے کو دو لخت کر دیا ہے۔ اقتدار امیر طبقے کے ہاتھ میں ہونے کی وجہ سے تعلیم زیادہ تر اسی طبقے کے مفادات کی حفاظت کرتی ہے۔ حتیٰ کہ دونوں نظاموں کے ذریعہ ہائے تعلیم بھی مختلف ہیں۔

(۳) ذریعۂ تعلیم کی عدم یکسانیت کے سبب تعلیم اپنے صحیح نتائج ظاہر کرنے میں ناکام ہو گئی ہے۔ غریب طبقہ اردو ذریعۂ تعلیم سے آ رہا ہے۔ امیروں کے بچے انگریزی ذریعۂ تعلیم کے پروردہ ہیں۔ اس تفریق کو نہ صرف یہ کہ ختم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی، بلکہ اس خلیج کو روز بروز اور بھی وسیع کیا جا رہا ہے۔ انگریزی تعلیم حاصل کرنے والے افراد (جن کی تعداد پورے ملک کی خواندہ آبادی کا صرف تین فی صد ہے) ملک کے حاکم بنتے ہیں اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے ہیں۔ غریب افراد چھوٹی نوکریوں میں کھپ جاتے ہیں۔ لیکن دونوں طبقوں کے درمیان کوئی قابل عمل رابطہ ہمارے تعلیمی دانش وروں نے پیدا نہیں کیا۔ اس فاصلے نے پورے نظام تعلیم کی برکات کا زیادہ حصہ اعلیٰ طبقے کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔ پورا تعلیمی نظام اس تضاد کی وجہ سے ملکی یک جہتی اور سالمیت کو منظم کرنے میں بری طرح ناکام رہا ہے۔ جس کا فطری نتیجہ یہ نکلا ہے کہ غیر ملکی تعلیم کے ساتھ ساتھ پاکستان میں غیر ملکی تعلیمی اداروں کی سرگرمیاں بہت تیز ہو گئی ہیں اور قومیت کی تشکیل نو کے امکانات کم ہوتے جا رہے ہیں۔ سیکولر ممالک کی طرح یہاں بھی کئی "ازم" تعلیم کے راستے ملک میں داخل ہوتے جا رہے ہیں۔ معاشرہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ اسے علاقائیت، صوبائیت، فرقہ پرستی، نصب العین کی گمشدگی اور دیگر کئی عارضے لاحق ہو چکے ہیں۔ کسی تعلیمی پالیسی نے بھی اس کے ازالے کی سعی نہیں کی، بلکہ ضرر رساں ذریعے کو اس درد کا علاج سمجھا گیا۔ قومی یک جہتی کا حصول علاقائیت کی حوصلہ افزائی قرار دیا گیا، جس سے خرابی اور بھی دور رس ہو گئی۔ پیچیدہ مسائل کو آسان سمجھ کر اس کا حل ایک ہی وسیلے سے کیا گیا اور اس سے حالات اور زیادہ خراب ہوئے۔ رفتہ رفتہ ملکی یک جہتی، اور وحدت فکر و عمل کی ساری راہیں مسدود ہوتی جا رہی ہیں۔

ہر تعلیمی پالیسی میں فکری تضادات کا ذکر تو ملتا ہے، لیکن علاج موجود نہیں اور اگر ہے تو غلط اور غیر منطقی۔ اکثر حل طلب مسائل کو حساس اور خطرناک قرار دے کر ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جاتی ہیں۔ کوئی حکومت بھی مسائل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی سکت نہیں رکھتی۔ مصلحتوں، سمجھوتہ بازیوں اور مسائل کو معلق رکھنے کی تدابیر سے مسائل اور بھی زیادہ الجھتے چلے گئے ہیں۔ حکومت بے نظیر کی ہو یا نواز شریف کی، دونوں کا رویہ مسائل کو حل کرنے کی بجائے ان سے پہلو تہی کا ہے۔ کیا اس کا سبب یہ تو نہیں کہ ایک جاگیردار طبقے کی نمائندہ ہے اور دوسرا صنعت کار طبقے کا سپوت ہے؟ دونوں طبقوں کے اپنے اپنے مفادات اور اپنا اپنا معیار زیست ہے۔ اُردو کو جو حیثیت دس برس قبل حاصل تھی، رفتہ رفتہ اس سے بھی پیچھے دھکیل دیا گیا ہے۔ اب پہلی جماعت میں انگریزی کا مضمون شامل نصاب اور انگریزی ذریعہ تعلیم کی اجازت بھی شروع ہی سے حاصل ہے۔

نئی تعلیمی پالیسی (۱۹۹۸ء - ۲۰۱۰ء) کے ذریعے اس روش کو استحکام بخشا گیا ہے۔ انگریزی کو برقرار رکھنے کے لیے اردو کو صوبائی زبانوں کا حریف بنا دیا گیا ہے، تاکہ اس آویزش کا پورا پورا فائدہ انگریزی زبان کو پہنچ سکے۔ ہم قومی زبان کے حوالے سے جہاں پچھلے چالیس برس میں کھڑے تھے، ایک لحاظ سے آج اس سے بھی بہت پیچھے چلے گئے ہیں۔

سمن آباد، لاہور

ڈاکٹر وحید قریشی

فصل اوّل

تعلیم کا نظریاتی پہلو

تعلیم، قرآن حکیم کی روشنی میں

پاکستان ایک اسلامی نظریاتی ملک ہے۔ اس اعتبار سے تعلیم کے مقاصد، غرض و غایت اور اصول تعلیم کے بنیادی نکات اسی فکری جہت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ قرآن حکیم میں علم اور حصول علم کی فضیلت پر بہت زور دیا گیا ہے۔ تاریخِ اسلام میں حصول علم کی عظمت کا راز تقدس میں پوشیدہ ہے۔ تقدس کو تعلیم و تعلم میں ضروری قرار دیا گیا۔ احترامِ استاد بنیادی معاشرتی اقدار میں شامل ہے۔ اسی لیے شاگرد کے لیے علم کے بارے میں سنجیدگی کے علاوہ مواد علم کو مقدس جاننے کا احساس بھی عام تھا۔ اکثر و بیشتر مساجد ہی مراکز تعلیم ہوا کرتی تھیں۔

علم کو معاشرتی زندگی میں ایک امتیازی مقام اور رتبہ حاصل تھا، جس کی بنیاد پر سماجی زندگی کے مختلف مظاہر میں تعلیمی ہما ہی ایک خاص اعتبار اور اعتماد کی چیز بن گئی تھی۔ اس سے نفسیاتی سطح پر معاشرے میں علوم کی گرفت مضبوط رہی اور علوم کے بارے میں تجزیے، تفکر اور قیاس کی اہمیت ایک سنجیدہ طرز عمل قرار پا کر اعلیٰ روحانی اور مادی اقدار کے حصول کا باعث ہو گئی۔ تعلیم کے بارے میں اس طرز فکر نے زندگی کے دوسرے دائروں کو بھی متاثر کیا۔ ملی زندگی کے دھارے میں مالی مفادات پس پشت چلے گئے اور علم کا حصول ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل کا باعث ہوا، جس میں مقاصد کے تصادم اور زندگی کے دورخے طرز عمل کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ساری دنیا کو

مسجد قرار دیا تھا۔ اس میں یہ حقیقت مدِ نظر تھی کہ دنیا کے بارے میں ہمارا طرزِ فکر سنجیدہ اور تقدس آمیز ہو اور ہم مادی زندگی ہی کو سب کچھ نہ جان لیں، بلکہ اس کے جملہ فوائد اور فیوض کو اعلیٰ مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنائیں۔ اس طرح مادی زندگی کو دینی نقطہ نظر کے تابع رکھ کر حیاتِ انسانی میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا گیا۔

ا

اسلام ایک مذہب نہیں، دین ہے۔ یہاں مذہبی امور الگ روحانی بستی نہیں بساتے، بلکہ ایک ضابطۂ حیات، ایک نقطۂ نظر اور ہمہ گیر خارجی پیکر رکھتے ہیں۔ دین اور دنیا دو الگ الگ حقیقتیں نہیں، بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ ان کے باہمی عمل اور ردِ عمل سے وہ اکائی ہاتھ آتی ہے جو اصل زندگی ہے۔ جس میں خیر و شر کی آویزش اور نیکی بدی کا امتیاز ایک اہم فریضہ ادا کرتا ہے۔ ذہن کی بیداری اور حق و باطل میں امتیاز کی صلاحیت وہ شرف ہے، جو انسان کو حاصل ہے اور جس کی بنا پر وہ پیہم جدوجہد اور مسلسل تگ و دو میں مصروف رہتا ہے۔ شیطانی اور رحمانی قوتوں کی پیکار سے حقائق کے بارے میں تیقن پیدا ہوتا ہے۔ نیز حقائق کی تعبیر، تشریح، تعمیم اور ترسیل کی راہیں کھلتی ہیں۔ سورۂ بقرہ میں تفویضِ خلافت کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اسماء سکھائے۔ فرشتوں کا یہ اعتراض تھا کہ تخلیقِ آدم کی ضرورت کیا ہے جب کہ وہ ہر حکم بے چون و چرا بجا لاتے ہیں۔ اس پر ارشادِ باری تعالیٰ ہوا کہ

قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (البقرہ ۲: ۳۰)

میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے۔

انسان کو اشیا کے نام بتانا، علامتی طور پر، نیک و بد کے شعوری رویے کی نشان دہی کرتا ہے۔ اپنے ادراک سے نیکی بدی میں فرق قائم کرنے کا اختیار انسانی زندگی کو ایک بااختیار عمل بناتا ہے۔ اس بااختیار عمل کا پہلا اظہار آدم کی بھول یا لغزش تھا۔ بقول اقبال انسانی انا کا یہ پہلا اظہار درحقیقت اس بات کا ثبوت ہے کہ آدم کو اپنے تشخص کا احساس ہو گیا تھا۔ اب فہم و فراست کے ذریعے ہی اصلی منزل کی طرف لوٹا جا سکتا تھا۔ آدم کا جنت

سے نکلنا، نظامِ کائنات کا ایک اہم واقعہ ہے جس سے داخلی اور خارجی زندگی میں آویزش کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا۔ زندگی — عمل و حرکت، خیر و شر کی کش مکش اور ظاہر و باطن میں مطابقت کے مسلسل عمل کا نشان بن گئی۔ علم کی راہیں شعورِ ذات کو ایک خاص نہج دیتی ہیں۔ یہ علم اشیا کے تجزیے پر مشتمل ہے اور انسان کی خوابیدہ صلاحیتوں کے لیے بیداری کا پیغام ہے۔ یہ علم فرسودگی اور کہنہ روی کا مخالف ہے اور تنقیدی رویے کا علم بردار ہے۔ اس میں مشاہدے اور تجزیے کو بنیادی درجہ حاصل ہے۔ یہ علم کائنات فہمی کا پیش خیمہ ہے۔ اس میں نیکی و بدی کا امتیاز، منزل کا تعین، حصول مقصد کے لیے جدوجہد اور حقائق میں ربط اور ہم آہنگی کی تلاش، وہ عناصر ہیں جو انسان اور کائنات کو ایک لڑی میں پروتے ہیں۔ اس طرح وہ وحدت جنم لیتی ہے جو کائنات کا مخفی راز ہے۔ روحانی اور مادی پہلوؤں کو ایک کل میں تبدیل کرنے کا یہ عمل داخلی عمل بھی ہے اور خارجی صورت میں تطبیق اور ترتیب کی تلاش کا رجحان بھی۔ گویا داخلی زندگی اور خارجی زندگی میں کلی ربط کا حصول شخصیت کی نشوونما کے لیے لازم ہے۔ اس لحاظ سے غایت علم، جملہ علوم کو اکائی کی شکل میں دیکھنے اور اس سے اخذ نتائج کا عمل ہے۔ یہاں مادی زندگی اصل مقصود نہیں، بلکہ حقیقت کبریٰ (Ultimate Reality) تک پہنچنے کی صرف ایک منزل ہے۔ تعلیم میں مقصد (objective) کا تعین اسی بنیادی حقیقت کی مدد سے ممکن ہے۔ کائنات کے جملہ پہلو اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں۔ قرآن پاک میں کائنات کو ربانی تجلیات اور آیات کا مظہر قرار دیا گیا ہے۔ اکثر آیات مقدسہ میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ مطالعہ کائنات، اصل مقصود (اللہ تعالیٰ) کا اقرار ہے۔

اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ○ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○ (آل عمران ۳: ۱۹۰-۱۹۱)

زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں، اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں، ان ہوش مند لوگوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں، جو اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں۔ (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں)" پروردگار یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا

ہے۔ تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔ پس اے رب، ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے

(ترجمہ تفہیم القرآن، جلد اول ص ۳۱۰-۳۱۱)

اللہ تعالیٰ نے ایک اور جگہ فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى يُخْرِجُ الْحَىَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ مُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَىِّ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ○ فَالِقُ الْاِصْبَاحِ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ○ وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِىْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ○ وَهُوَ الَّذِىْٓ اَنْشَاَ كُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّ مُسْتَوْدَعٌ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ○ وَهُوَ الَّذِىْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَىْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ اِنَّ فِىْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○ (الانعام ٦ : ٩٥-٩٩)

دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا اللہ ہے۔ وہی زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور وہی مردہ کو زندہ سے خارج کرتا ہے۔ یہ سارے کام کرنے والا تو اللہ ہے، پھر تم کدھر بہکے چلے جا رہے ہو؟ پردۂ شب کو چاک کر کے وہی صبح نکالتا ہے۔ اسی نے رات کو سکون کا وقت بنایا ہے۔ اسی نے چاند اور سورج کے طلوع و غروب کا حساب مقرر کیا ہے۔ یہ سب اسی زبردست قدرت اور علم رکھنے والے کے ٹھیرائے ہوئے اندازے ہیں، اور وہی ہے جس نے تمہارے لیے تاروں کو، صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں راستہ معلوم کرنے کا ذریعہ بنایا۔ دیکھو ہم نے نشانیاں کھول کر بیان کر دی ہیں، ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔ اور وہی ہے جس نے ایک متنفس سے تم کو پیدا کیا۔ پھر ہر ایک کے لیے ایک جائے قرار ہے اور ایک اس کے سونپے جانے کی جگہ۔ یہ نشانیاں ہم نے واضح کر دی ہیں۔ ان لوگوں کے لیے جو سمجھ بوجھ رکھتے ہیں اور وہی ہے، جس نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعے سے ہر قسم کی نباتات اگائی۔ پھر اس سے

ہرے ہرے کھیت اور درخت پیدا کیے۔ پھر ان سے تہ بر تہ چڑھے ہوئے دانے نکالے اور کھجور کے شگوفوں سے پھلوں کے گچھے کے گچھے پیدا کیے جو بوجھ کے مارے جھکے پڑتے ہیں، اور انگور زیتون اور انار کے باغ لگائے جن کے پھل ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہیں اور پھر ہر ایک کی خصوصیات جدا جدا بھی ہیں۔ یہ درخت جب پھلتے ہیں تو ان میں پھل آنے اور پھر ان کے پکنے کی کیفیت ذرا غور کی نظر سے دیکھو۔ ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔

(ترجمہ تفہیم القرآن جلد اول، ص ۵۶۵-۵۶۷)

علامہ محمد اقبال نے ان آیات کریمہ کے مطالب کو دور حاضر کی اصطلاحات کے حوالے سے یوں بیان کیا ہے:

But inner experience is only one source of human knowledge. According to the Quran, there are two other sources of knowledge:Nature and History; and it is in tapping these sources of knowledge that the spirit of Islam is seen at its best. The Quran sees signs of the Ultimate Reality in the 'sun,' the 'moon,' the lengthening out of shadows, 'the alternation of day and night,' 'the variety of human colour and tongues,..... in fact the whole of Nature as revealed to the sense-perception of man. And the Muslim's duty is to reflect on these signs and not to pass by them 'as if he is deaf and blind,' for he 'who does not see these signs in this life will remain blind to the realities of the life to come.' This appeal to the concrete combined with the slow realization that, according to the teachings of the Quran, the universe is dynamic in its origin, finite and capable of increase, eventually brought Muslim thinkers into conflict with Greek thought which, in the beginning of their intellectual career, they had studied with so much enthusiasm.

(The Reconstruction, p. 102)

مادی زندگی اور اس کے جملہ پہلو ارفع مقاصد کے حصول کا وسیلہ ہیں۔ یہ نقطۂ نظر، حیات و کائنات کے مطالعے کو مقصود بالذات نہیں رہنے دیتا، بلکہ کائنات کے مطالعے اور اشیا کے ادراک کے جملہ نتائج کو باہم مربوط کر کے اعلیٰ تر حقیقت کی طرف لے جانے میں مدد دیتا ہے۔ اس مرحلے پر مادی زندگی اور اس کے جملہ مظاہر بھی مقدس بن جاتے ہیں۔ علامہ اقبال نے خطبات میں اس حقیقت کی طرف واضح اشارہ کیا ہے۔

The Uitimate Reality, according to the Quran, is spiritual, and its life consists in its temporal activity. The spirit finds its opportunities in the natural, the material, the secular. All that is secular is, therefore, sacred in the roots of its being. The gratest service that modern thought has rendered to Islam, and as a matter of fact to all religions, consists in its criticism of what we call material or natural_a criticism which discloses that the merely material has no substance unitl we discover it rooted in the spiritual. There is no such thing as a profane world. All this immensity of matter constitutes a scope for the slef-realization of spirit.

(The Reconstruction, p. 123)

حیات و کائنات کو ایک کل کے طور پر دیکھنے کا شعور جب عملی طور پر بروئے کار آیا تو اشیا کے ادراک کے لیے روحانی اور وجدانی حقائق کو بھی اہم سمجھا گیا۔ کائنات کے جملہ مظاہر پر دینی نقطۂ نظر ہی سے نگاہ ڈالی گئی۔ دین و دنیا کی دوئی (dichotomy) کو مٹا کر جس کل کی تشکیل ہوئی، اس میں مذہب کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ منفی قوتوں پر مثبت کی فتح ہی تعلیم کا بنیادی فریضہ تھا۔ اور صرف اسی وقت دنیا مقدس ہو سکتی تھی، جب اس میں اساسی حیثیت ان اقدار و اعمال کی ہو جائے، جو روحانی واردات کی طرف رہنمائی کریں۔

علوم کے حصول میں یہ ایک بنیادی بات ہے کہ زندگی کا کوئی سا شعبہ بھی اس وقت تک صحیح نتائج کے استخراج میں معاون نہیں ہو سکتا، جب تک اس کا تعلق دوسرے شعبوں کے ساتھ دریافت نہ ہو جائے۔ زندگی کا کوئی ایک شعبہ پوری حقیقت کا نمائندہ نہیں ہے۔ نہ مادی زندگی حقیقت کلی کی نمائندگی کرتی ہے اور نہ روحانی زندگی ہی مادی زندگی سے جدا ہو

کر حقیقت کی دریافت میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ سائنسی علوم ہوں یا علم و ادب کے ذخائر، سماجی علوم ہوں یا فنونِ لطیفہ، کوئی ایک شعبہ علم قائم بالذات قرار پا کر رازِ حیات کو منکشف نہیں کر سکتا — یہ تو سب پورے تجربے کے بکھرے ہوئے اجزا ہیں۔ یہی حال انسان کا ہے۔ اس کی ذات اگر الگ الگ خانوں میں منقسم ہے تو وہ حقائق کی تہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ حقیقت کلی کا ادراک کرنے کے لیے شخصیت میں فکری و روحانی وحدت درکار ہے اور ذات سے باہر کی دنیا میں بھی علوم کو الگ الگ لے کر حقیقت کا کوئی مجموعی تصور ممکن نہیں۔ علامہ اقبال نے سائنس کے حوالے سے بڑی پتے کی بات کہی ہے، فرماتے ہیں:

> There is no doubt that the theories of science constitute trustworthy knowledge, because they are verifiable and enable us to predict and control the events of Nature. But we must not forget that what is called science is not a single systematic view of Reality. It is a mass of sectional views of Reality—Fragments of a total ex perience which do not seem to fit together."
>
> *(The Reconstruction, p. 33)*

دورِ حاضر کی زبان میں ان مسائل کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

۱۔ اسلام میں دین اور دنیا جدا گانہ حقیقتیں نہیں ہیں۔ ہمارے نظامِ تعلیم میں دونوں کو اکائی کے طور پر لینا ہوگا۔ یہ توحید کا سماجی پہلو ہے۔ فکر و نظر کی دوئی کو ختم کرنا ہوگا، تاکہ تعلیم سے جملہ علوم کا حصول مثبت قدروں کے حوالے سے ہو سکے۔ علم کی غایت، نیکی کی تلاش اور بدی کی تردید ہے۔

۲۔ اس نظامِ تعلیم میں دین کا پلہ بھاری ہونا چاہیے اور دیگر علوم کو اسی سیاق و سباق میں رکھ کر پیش کرنا ہوگا، تاکہ علم کا مقصودِ اصلی یعنی روحانی و اخلاقی واردات کے ذریعے حقیقتِ کبریٰ تک رسائی ممکن ہو سکے اور کائنات کو ایک کل کے طور پر دیکھ کر حقیقت کو مکمل طور پر گرفت میں لیا جاسکے۔

۳۔ جملہ علوم میں وحدتِ فکری (intergrated approach) ضروری ہوگی یعنی:

• ہر علم کو دوسرے علم کے حوالے سے دیکھنا ہوگا اور ان کے مابین کامل ہم آہنگی ضروری ہوگی۔

• دین اور دنیا کی الگ الگ تقسیم ختم کر کے انسانی فکر کو دنیا سے دین کی طرف سفر کرنے میں مدد دی جائے گی۔

• علم کی غایت نیکی کی تلاش اور بدی کی مذمت ہے۔ جملہ علوم و فنون کی تدریس کو اس بنیادی جہت پر مرتکز کر کے جملہ علوم کی وحدت دریافت کرنا ہو گی۔

۲

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے، اس کا تعلق تعلیم کے بارے میں بنیادی رویے سے ہے۔ قرآنِ حکیم میں جس طرح ان مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس سے تعلیم کے بارے میں بنیادی رخ کا تعین ہو جاتا ہے۔ اس کا نصب العین طے ہو جاتا ہے۔ قرآن پاک دین کی کتاب ہے۔ اس میں سماجی زندگی کے اصولی مباحث بیان ہوئے ہیں، تفصیلات نہیں ہیں۔

پاکستان کے لیے کون سا نظام تعلیم مفید ہو گا؟ اس نظام تعلیم کا پورا ڈھانچہ کیا ہو؟ اس کے لیے نصابی کتب اور منصوبہ بندی کے دیگر وسائل کیا ہوں؟ علوم و فنون اور ادبیات کے درمیان فرق مراتب کس طرح کیا جائے؟ یہ مسائل بنیادی فکری جہت کی روشنی میں طے کرنے ہوں گے --- قرآنِ حکیم میں مطالعہ کائنات اور تاریخ کو جو اہمیت دی گئی اور جس کی طرف اقبال نے واضح اشارے کیے ہیں، اس کو بھی پیش نظر رکھنا ہو گا۔

ایک نظریاتی ریاست میں اتنا تو بہر حال یقینی ہے کہ سیکولر رجحانات کی پرورش کو نصاب تعلیم میں مطلوب و مقصود نہ سمجھا جائے گا اور نصاب تعلیم کا بنیادی مقصد ان اقدار و اوصاف کو قرار دینا ہو گا، جو قرآن پاک میں بیان ہوئے ہیں۔ اسلام اسی اعتبار سے دیگر مذاہب سے مختلف ہے کہ اس نے دین کی حمایت میں دنیا کی نفی نہیں کی، بلکہ دنیا کو دین تک پہنچنے کے لیے ایک زینے کے طور پر استعمال کیا ہے اور دنیاوی فوائد کے حصول کو خیر و برکت کی چیز جانا ہے، بشرطیکہ اس سے نظر دھندلا کر، دنیاوی امور میں گم ہو کر نہ رہ جائے۔

قرآن نے ماضی، حال اور مستقبل کی اکائی کو تسلیم کیا ہے، نیز دنیا اور آخرت کو بھی ایک وحدت کے طور پر قبول کیا ہے۔ تواتر و تسلسل کو حقیقت اشیا میں مرکزی نقطے کے طور

پر برتتے ہوئے عمل، حرکت اور جدوجہد کو زندگی کا حاصل سمجھا ہے۔ دنیا کو اس سطح پر قبول کرنے کی وجہ سے اسلام کا دستور العمل بنیادی مقاصد کے حصول پر مجتمع ہوا ہے۔ باقی رہے دنیاوی امور، اور مختلف ادوار میں زندگی کے تغیرات، اسلام نے ان پہلوؤں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ کوئی دور پہلے دور کی تکرار نہیں ہوتا، بلکہ حقائق کے نت نئے پہلو سامنے آتے رہتے ہیں۔ اس طرح زندگی تسلسل اور ارتقا سے دوچار رہتی ہے۔

مسلمانوں کی فکری اور سماجی تاریخ میں مختلف نظاموں کو آزمایا گیا، یہ اسی حرکی تصور (dynamic concept) کے طفیل ممکن تھا۔ ان سے جو عناصر اخذ کیے گئے نظام فکر میں جذب کر لیے گئے۔ یہ وہ عناصر تھے، جن سے بنیادی مقاصد کی نفی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اجزا رد ہوتے رہے، جو انسانی ارتقا میں حارج یا اس سے براہ راست متصادم ہوئے۔ رد و قبول کا یہ عمل مسلسل ارتقا پذیر معاشرے کا حصہ ہے۔ اس لیے تجزیے، مشاہدے اور عقیدے کی سان پر مختلف نظاموں کو پرکھا جاتا رہا ہے۔ خیر و شر کی آویزش میں انسانی فکر کی نمو پذیری کے لیے اس طرح کا تصادم ضروری بھی تھا۔

آج کی متمدن دنیا میں علوم و فنون پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسعت اختیار کر چکے ہیں اور زندگی اتنی سادہ نہیں جتنی قرون وسطیٰ میں تھی۔ اس تناظر میں تصادم اور آویزش کا عمل بھی تیز تر ہو چکا ہے۔ اس سارے بحران سے باہر نکلنے کی ایک ہی صورت ہے کہ ہمارے ہاں ایسا نظام تعلیم رائج ہو جس کی بنیاد قرآن اور سنت پر ہو اور اس کی تفصیلات دور حاضر کی معاشرتی زندگی کے حوالے سے متعین کی جائیں۔ نت نئی سائنسی ایجادات، نئے نئے علمی نظریات، ذہنی واردات کے نرالے گوشے، اشیا کی ماہیت کے بارے میں نئے نئے انکشافات اور اقتصادی اور سیاسی مسائل نے دنیا کی طنابیں کھینچ کر نئی صورت حال پیدا کی ہے۔ جنگ و جدل کے نئے طریقے، سیاسی انقلابات کے روز افزوں دھماکے، تسخیر کائنات کے نئے نئے وسائل اور سرمایہ و محنت کی آویزش، گویا کہ یہ سارے مسئلے ایک خاص خارجی قوت اور باطنی نظر کے محتاج ہیں۔ ایسے میں مسلمانوں کی سماجی تاریخ بھی معاون ہو سکتی ہے جس میں مسلمانوں نے عقائد و افکار، خارجی شکل میں منتقل کرنے کی کوشش کی، بقول علامہ اقبال

ضبط کن تاریخ را پایندہ شو | از نفسہائے رمیدہ زندہ شو
سر زند از ماضیِ تُو حالِ تُو | خیزد از حالِ تُو استقبالِ تُو
مشکن ار خواہی حیاتِ لازوال | رشتۂ ماضی و استقبال و حال
موجِ ادراکِ تسلسل زندگی است | میکشاں را شورِ قلقل زندگی است

اقبال نے مسلمانوں کے جملہ علوم میں تاریخ کو ملت کے لیے بہت ضروری قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ ماضی، حال اور مستقبل کی اکائی ماضی کے تجربات سے جدا نہیں کی جا سکتی۔ مسلمانوں کی تمدنی تاریخ میں جو اہمیت تاریخ کے مضمون کو حاصل رہی ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں۔ تاریخ اور دیگر علوم میں ارتباط کی کیا صورت ہو؟ دنیاوی علوم کو زندگی کے بہاؤ میں کتنی اہمیت دی جائے؟ یہ مسائل اپنے دامن میں بہت سے تانے بانے رکھتے ہیں۔ لیکن ایک بات شاید بے موقع نہیں کہ نظامِ تعلیم کی تشکیلِ جدید میں، مقصدِ تعلیم کے علاوہ علوم کے جملہ ذخائر کی درجہ بندی بھی ضروری ہو گی۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے سے لے کر عصرِ حاضر تک تعلیم میں جو تجربات ہوئے، ان سے بعض بنیادی فکری دھارے سامنے آئے۔ نئے نظامِ تعلیم کی تشکیل میں ان پر نظر ڈالنا بھی مفید ہو گا۔ ماضی کے تجربات کی تکرار تو ممکن نہیں، لیکن خود آگاہی کی خاطر یہ ضروری ہے کہ انسان حال و مستقبل میں اپنا راستہ بنانے کے لیے ماضی کے شعور سے استفادہ کرے۔ بنیادی نصب العین کو زمان کی حدود سے مکان میں لانے کے عمل میں، تعلیمی نظام کیا خدوخال قائم کرے، اس کے لیے ماضی کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔

قرآن پاک تعلیم کا رکنِ اول تھا۔ نصابِ تعلیم میں اسی مرکز کے گرد دیگر علوم کا مطالعہ کیا گیا۔ قرآن خوانی اور قرآن فہمی کے لیے مسجد ہی اولین درس گاہ تھی۔ چنانچہ مکتب کی تعلیم میں کلمہ، اذان، آیت الکرسی اور سورۃ الحشر سے درس تعلیم کا آغاز ہوا۔ یہ سلسلہ ابتدائی کلاسوں سے اعلیٰ درجوں تک چلا۔ مکتب سے مدرسے کا تصور پیدا ہوا۔ مطالعہ قرآن میں اول صرف و نحو کو واضح اہمیت ملی۔ چنانچہ قرآن و حدیث کے ساتھ صرف و نحو بھی درسیات میں شامل ہوئے۔ جب اسلام حدودِ عرب سے پھیل گیا اور غیر عرب باشندوں کو بھی مطالعہ قرآن کا احساس ہوا تو علم صرف و نحو کو زیادہ تقویت ملی۔ اس کے ساتھ ہی علم تجوید، علم تفسیر اور

علم حدیث کے علاوہ علوم مفیدہ میں ریاضی، الجبرا، جیومیٹری، نجوم، کیمیا اور سماجی علوم میں جغرافیہ، تاریخ، سوانح، طب وغیرہ کا اضافہ ہوتا گیا۔ علم فقہ نے بھی مستقل شکل اختیار کر لی۔
(علامہ شبلی نعمانی، مقالات شبلی، جلد سوم، ص۱-۸)

مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، بصرہ، کوفہ، یمن، دمشق اور قاہرہ عالم اسلام میں تعلیم کے مرکز بنے اور بعض مقامات نے علوم کی کئی شاخوں میں اختصاص (centers of excellance) کا درجہ پایا۔ درسیات کا یہ سارا مطالعہ قرآن کے گرد گھومتا تھا۔ اس لحاظ سے علوم میں وحدت کا عمل بحال رہا۔ کیونکہ یہ علوم ایک ہی بنیادی ضرورت کو پورا کرنے میں مصروف تھے۔ مختلف پیشوں کو لیجیے تو فوجی ضرورتوں کے تحت ان مدرسوں سے الگ فنون حرب اور صنعتوں کا رواج رہا۔ حیات انسانی کے یہ پہلو بھی اسلامی نقطہ نظر اور ذرائع استعمال میں حلال و حرام کے پابند تھے۔ یہاں بھی فکر پر نصب العین کی چھاپ لگی تھی۔

تعلیم کا دائرہ تلاش خیر اور انسان کو انسان بنانے پر مشتمل تھا، یعنی تعلیم کا روحانی اور اخلاقی محور یہاں بھی برقرار رہا۔ بنو عباس کے زمانے میں مسلمانوں کو یونانی علوم سے سابقہ پڑا۔ یونانی فلسفے کی کتابوں کے تراجم کا ایک سیلاب سا آ گیا۔ بقول علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۰ء-۱۹۱۴ء)، فلسفے کی کتب کے یہ تراجم اکثر عیسائی مترجمین نے کیے اور ان میں بھی فلسفہ و طب کے سوا باقی علوم نظر انداز کیے گئے۔ خصوصاً یونانی تاریخ، مذہب اور زبان دانی سے بے اعتنائی برتی گئی۔ اسلام کی امتزاجی سوجھ بوجھ (synthesis) کو ایک نئے امتحان سے دوچار ہونا پڑا۔ عقلی علوم کے فروغ سے نئے نئے مسائل درپیش ہوئے۔ مابعد الطبیعیاتی مباحث نے فلسفیانہ فکر کے لیے چیلنج کی صورت اختیار کر لی۔ قبل اسلام کے عرب میں علوم و فنون کے پیچھے کارفرما فکری عوامل میں زیادہ سکت نہ تھی۔ نیز اسلام نے قبل اسلام کے صرف ان عناصر کو رد کیا تھا جو اسلام کے منافی تھے۔ اس لیے انجذاب کا عمل نسبتاً آسان تھا، لیکن یہاں یونانی فلسفے سے سابقہ تھا جس کی روایت بالکل الگ فکری نظام سے وابستہ تھی۔

مابعد الطبیعیاتی مسائل میں یونان اہم مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس اعتبار سے یہاں روایات کا تواتر اور تسلسل یونانی فلسفے کی اساس کو استوار تر کرنے کا موجب رہا۔ رد و قبول کا عمل دو بنیادی نکتہ ہائے فکر کے تصادم کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اول یونان سے مرعوبیت کا احساس ہوتا ہے، لیکن جلد ہی مسلمان مفکرین نے یونانی فلسفے کو پورے کا پورا ہضم کرنے

سے انکار کر دیا اور اس امتزاجی روح کا سہارا لیا، جس کی اساس پر مختلف ممالک کی تہذیبی زندگی کے ان عناصر کو تو قبول کیا گیا جو اسلام کے بنیادی افکار پر منفی اثر نہیں ڈالتے تھے، لیکن ان عناصر کو رد کر دیا گیا جو اسلام کی روحانی اور اخلاقی اقدار کے منافی تھے۔ اس تمدنی عمل کا تجربہ عراق اور ایران کی سرزمین میں مسلمانوں کو پہلے سے ہو چکا تھا۔ یونانی فکر کا مقابلہ انہی فلسفیانہ تصورات کے ذریعے کیا گیا جو یونان سے آئے تھے۔ قرآن حادث ہے یا قدیم؟ تقدیر کا مسئلہ کیا ہے؟ کائنات کیا ہے؟ خدا کیا ہے؟ ان مسائل کو فلسفیانہ فکر ہی کی مدد سے حل کرنے کے سعی کی گئی۔ منطق استقرائی اور منطق استخراجی سے کام لیا گیا۔ مابعد الطبیعیاتی مسائل میں معتزلی افکار کی نمود اسی نقطہ نظر کو ظاہر کرتی ہے کہ مسلمانوں کے افکار، یونانی افکار کے مقابلے میں ایک کش مکش سے دوچار ہیں۔ علم کلام وضع ہوا اور علوم اسلامی میں ایک نئی شاخِ علم پھوٹی۔

اس ساری سماجی کشمکش میں مسلمانوں نے باہر سے آنے والے علوم اور فکری سوتوں کو عملی طور پر دیکھا بھالا۔ ان کے وہ پہلو جو قابل قبول تھے، اختیار کیے اور ان کی شدید مخالفت کی جو بنیادی اساس کو منہدم کرنے کے درپے تھے۔ مسلمان مفکرین نے آنکھیں بند کر کے چلنے کی بجائے افکار کی موجِ طوفان خیز میں اپنے آپ کو ڈال دیا۔ اس سے تجزیے کی وسعت، مشاہدے کی اصابت اور نئے ماحول میں مطابقت کی تلاش جاری رہی۔ اس امتحان میں پڑنے کا نتیجہ یہ تھا کہ فکر و نظر میں تالیف و امتزاج کا عمل جاری رہا اور اسلامی افکار کی نئی تعبیر و تشریح کی گنجائش پیدا ہوئی۔ یونانیوں کے ہاں سے خطابت کے اصول بھی اخذ کیے گئے اور معقولات کو نظام تعلیم میں جگہ دی گئی۔ لیکن یہ سارا عمل طوفانی نہیں تھا، بلکہ تدریجی اور آہستہ رو تھا۔ اس انجذاب کی تہ میں اسلامی فکر کی وحدت برقرار رہی۔ یونانی علوم کی "دنیا داریت" منسوخ کر کے اس کے وہ عناصر لیے گئے جو بنیادی فکر سے متصادم نہ تھے۔

زبان کا معاملہ بھی تصفیہ طلب تھا۔ عرب علاقوں سے نکل کر عجم میں کاروبار خلافت پھیل رہا تھا اور ذریعۂ تعلیم کے لیے مقامی زبانوں کی اہمیت کا احساس کیا جانے لگا تھا۔ ایسے میں وہی مرکزی فکری رویہ کام آیا جس نے افکار کی آمیزش کے عمل میں دست گیری کی تھی۔ اسلام کی دعوت عرب سے اٹھی تھی اور قرآن پاک عربی زبان میں نازل ہوا تھا۔ درس و تدریس میں عربی زبان کی اہمیت مسلّم ہے۔ فتح ایران کے بعد جب اسلام عجم میں پھیلا تو

فارسی زبان نے نصاب میں نمایاں جگہ پائی۔ تمدنی اور مذہبی برتری کے سبب عربی زبان کی مرکزی اہمیت تھی اور بقول پروفیسر براؤن، "ایرانیوں نے عربی زبان میں جو کتابیں لکھیں، اگر انھیں عربی کے سرمائے سے نکال دیا جائے تو عربی زبان و ادب کا بیشتر ذخیرہ ضائع ہو جائے"۔ ایک مدت تک تصنیفی کام عربی ہی میں ہوتا رہا۔ رفتہ رفتہ جب ایران کے مختلف شہروں میں علمی مرکز قائم ہوئے اور مقامی باشندوں کی تعلیم کی ضرورت محسوس ہوئی تو فارسی نے بھی جگہ پائی۔ اس کے بعد جب مسلمان دوسرے ممالک میں پہنچے تو وہاں کی مقامی زبانوں سے بھی واسطہ پڑا۔ اس فضا میں زبانوں کا مسئلہ بھی خاص توجہ کا مستحق ٹھیرا۔ مسلمانوں کے زبان کے بارے میں رویے کے دو پہلو قابل توجہ ہیں:

اول: زبان مسلمانوں کے نزدیک اظہار کا وسیلہ ہے، پوجا کی چیز نہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ شاہد ہے کہ جہاں انھوں نے "ہر ملک، ملک ماست کہ ملک خدائے ماست" کہہ کر علاقائی تعصبات کی نفی کی اور ملکوں کو "دھرتی ماتا" قرار نہیں دیا، اسی طرح انھوں نے لسانی معاملات کو بھی مذہبی تقدس کا درجہ نہیں دیا، بلکہ اسے اظہار کا وسیلہ قرار دے کر ہر مقامی زبان سے کام لیا۔

دوم: زبانوں کے معاملے میں سماجی عناصر کے تحت ایک مستقل روش متعین کر لی۔ معاشرتی زندگی میں، دین کی مقدس زبان ہونے کی وجہ سے، بلاشبہ عربی کو دیگر زبانوں پر برتری تھی۔ ایران میں اسلام کی صدیوں پرانی روایت نے فارسی کو ثقافتی درجہ دیا اور عربی کے بعد اس کا چلن ہوا۔ پھر دوسرے ممالک تک آتے آتے درجہ بندی کا یہ اصول قائم ہو گیا کہ پہلے عربی، پھر فارسی اور پھر جس علاقے میں مسلمان گئے، اس کی مقامی زبان اہم سمجھی گئی۔ درجہ بندی کے اس اصول نے لسانی مباحث کو بے راہ ہونے سے بچا لیا۔

بنو عباس کے دور میں مسلمانوں کے علم و ادب پر یونان کی چھاپ لگ گئی۔ لیکن یہ پودا بھی دین کی سرزمین پر اگایا گیا، اس لیے یونانی علم کے نقصانات سے یہ لوگ محفوظ رہے۔ یونان کا جوڑ تو یہ عباسی دور میں تھا، اس کی شناخت ایک لطیفے سے کی جا سکتی ہے۔

مامون الرشید نے خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ مسند پر بیٹھے ہیں۔ آگے بڑھ کر پوچھا:

"آپ کون بزرگ ہیں؟"

جواب ملا: "ارسطو"

مامون نے عرض کی: "اے حکیم اچھی چیز کیا ہے؟"

جواب تھا: "عقل جسے اچھا کہے"

مامون کہنے لگے: "حکیم مجھے کوئی نصیحت کیجیے"

ارسطو کا جواب تھا: "توحید اور صحبت نیک"

عباسیوں کے ہاں ارسطو کچھ اس طرح مسلمان ہوا کہ آج بھی علم کلام کے موجد ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ یہ فیض کئی تبدیلیوں کا باعث ہوا۔ یونانی علوم کا فیضان اسلامی نظام فکر میں دراصل بعض نئی تفصیلات کا اضافہ کرنے کا باعث ہوا۔ یونان کے فلاسفہ نے فکر اسلامی کو ایک نئی جہت (dimension) دی۔ اس نئی صورت حال میں غور و فکر کے نئے نئے راستے دریافت ہوئے۔ دین و دنیا کے مابین ہم آہنگی کا ایک تازہ طریقہ وضع ہوا جس میں فلسفے کی مدد سے تاویل، تشریح، امتزاج اور دفاع کی کئی شکلیں پیش نظر تھیں۔ علم کلام اس صدی کا سب سے اہم فکری دبستان تھا۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس زمانے میں بھی زندگی کی دوعملی کا بدستور خاتمہ ہوتا رہا۔

زندگی کی خارجیت اور باطنیت کے الگ الگ اسلوب اور رویے اسلام نے پہلے سے ہی مسترد کر رکھے تھے۔ اس کے زیر اثر بقول ڈاکٹر سید محمد عبداللہ (تعلیمی خطبات) دنیا میں بغداد کی علمی درس گاہیں، زندگی کی ہمہ گیری، دین و دنیا کی وحدت، مادہ و روح کا اشتراک اور علم میں عدم مقامیت کی وجہ سے اہم ہیں۔ جستجو اور مشاہدے کی آرزو نے کوفہ و بصرہ کی تعلیم کے انسانیاتی رخ ابھارے۔ بنیادی فکری رجحانات کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں ظاہر و باطن کی مطابقت، استقراء و قیاس کی مقبولیت، آزادی رائے کی اہمیت اور تقلید کے بجائے اجتہادی نقطۂ نظر کی عظمت، یادگار عناصر شمار ہو سکتے ہیں۔

اس دور میں ایک خاص طرح کی ضابطہ پسندی کا سراغ بھی ملتا ہے۔ لیکن یہ ضابطہ پسندی کسی بنے بنائے سانچے یا کسی ایسے بیرونی خول کی صورت نہیں رکھتی جس کے زیر اثر انسان اپنے آپ کو بے بس، محصور اور بے اختیار محسوس کرتا ہو۔ فکر کا یہ پرتو، اس خارجی ضبط کا نتیجہ ہے جو اس زمانے کے انسان کی داخلی زندگی کو مربوط اکائی میں منتقل کرنے کی

صلاحیت رکھتا تھا۔ آزادی فکر کی اس متاع گراں بہا نے علوم و فنون میں ترقی کی راہ ہموار کی۔
کم و بیش اسی زمانے میں بنو عباس کے درباروں میں ایرانی شان و شوکت نے غلبہ حاصل کیا۔ درباری زندگی دینی عنصر سے محروم ہوتی چلی گئی۔ بعض فنون (خصوصاً فنون لطیفہ) کے دینی رشتے کمزور پڑتے گئے۔ یہ فنون اپنے اصل سے جدا ہو کر علاحدہ اور قائم بالذات بنیادوں پر بعض ایسے گروہوں کی میراث ہو گئے جن میں دینی فکر کی رو بہت کمزور تھی۔ موسیقی، عالم اسلام میں ریاضی کی شاخ تھی، اب عیش و عشرت سے منسلک ہوئی۔ گانے والیوں کے طائفے اس فضا میں خوب مقبول ہوئے۔ اب عیش سے مراد زندگی میں عیاشی ہو گئی۔ تاہم علوم کے باہمی رشتے نئی نئی فکری تعبیروں کا موجب ہوئے۔ طب، علم الابدان اور نفسیات سے متعلق ہوئی۔ روحانی امراض کی تلاش کے علاوہ طب میں متعدی امراض کی پہچان بھی اس لیے ہوئی کہ طبیب اپنی ذات سے باہر نکل کر دیکھنے لگا تھا۔ علم کلام نے فلسفہ منطق اور مذہب کی آمیزش سے زندگی پائی۔ شاعری نے درباری، دینی اور سماجی علوم کے علاوہ سائنسی اصطلاحات کو اپنایا۔ مصوری نے توازن اور ترتیب کے اصول اپنا کر جیومیٹری اور گل کاری سے ناطہ جوڑا۔ مصوری میں تزئین و آرائش کے لوازم ابھرے اور دربار اور لونڈ سکیپ کی جزئیات کو اپنایا۔ فن تعمیر نے مساحت کی حدود سے گزر کر جمالیات کے دروازے پر دستک دی۔ غرض کہ امتزاجی رویہ، فنون لطیفہ، سماجی علوم، ادب اور سائنس میں یوں نمایاں ہوا کہ علوم و فنون کی مجموعی روح، ایک ایسے احساس کا پیش منظر بنی کہ خارجی زندگی اور باطنی واردات کی حدیں آپس میں گھل مل گئیں۔

یہ سب کچھ شاید اس لیے بھی ممکن ہوا کہ عوامل کی رَو پیچھے سے ایک خاص انداز نظر لے کر آرہی تھی۔ نیز دنیا میں علوم میں ابھی وہ وسعت نہیں آئی تھی جس سے دنیا بیسویں صدی میں متعارف ہوئی۔ اس زمانے میں فرد واحد جملہ علوم کو ایک محدود مدت میں سمیٹنے کی ہمت رکھتا تھا۔ علم کی حدود فرد واحد کی گرفت سے نکل کر اختصاص کی متقاضی نہیں ہوئی تھیں۔ دور حاضر کا انسان جس آشوب سے آج دوچار ہے، قدیم زمانے کا عالم اس کا گمان بھی نہیں کر سکتا تھا۔ تعلیم کی وحدت کا مسئلہ آج کی ترقی یافتہ دنیا میں علوم کے پھیلے ہوئے سمندر کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے، خصوصاً جب کہ حفظ قرآن کی وہ روایت بھی اب ہمارے ہاں رائج نہیں رہی، جس سے حافظہ قوی ہو کر علوم کے وسیع و عریض رقبے

کو طے کیا کرتا تھا۔ اب ہم نے یہ کام ذہن کی بجائے کمپیوٹر پر چھوڑ رکھا ہے۔

بنو عباس کے دور میں یونانی فلسفے کی یورش محدود دنیا کے حصار میں کچھ کم طوفان خیز نہ تھی۔ اس سیلاب نے علوم اسلامیہ کے در و دیوار کو ہلا کر تعمیر نو پر مجبور کر دیا۔ لیکن مسلمانوں نے اس چیلنج کو قبول کر کے تعلیمی نظام کی مدد سے حل کر لیا۔ تعلیم کی مخصوص جہت مقرر کر لینے کے بعد، نظام تعلیم کی تفصیلات کا مسئلہ تھا۔ سابق دور میں مساجد تعلیم کے اصلی مراکز تھیں۔ ان کے علاوہ شہنشاہیت کے دور میں بعض مدرسے سرکاری امداد سے جاری ہوتے رہے۔ چند شہروں نے بعض خاص خاص علوم میں شہرت حاصل کی اور وہ آج کل کی اصطلاح میں centre of excellance بھی بنے۔ یہ تعلیم مذہبی امور کی گود ہی میں پلتی رہی۔ معاشرے میں علم کا اعتبار قائم تھا۔ اس لیے علما کو سوسائٹی میں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ فرمانروا بھی اداروں کی مالی امداد و اعانت کرتے تھے اور بعض بڑے بڑے اداروں کی داغ بیل بھی انھوں نے ڈالی (مقالات شبلی، ج ۳، ص ۵۱، ۷۳)۔ لیکن ان پر سرکاری کنٹرول اور مداخلت نہ تھی۔ صدرالصدور کے وسیلے سے وظائف بھی دیے جاتے، پھر بھی سرکار مدرسوں کے انتظامی امور میں دخل انداز نہیں تھی۔ نیز تعلیمی شعبہ، دینی شعبے سے الگ بھی نہ تھا اور یہاں بھی تعلیمی نظام پر قبضے کی بجائے امداد و اعانت کی مدات پر توجہ تھی۔ تعلیم کو آزاد رکھا گیا تھا۔

بنو عباس کے دور میں بھی سابقہ ادوار کی طرح دینی مدارس کی داخلی آزادی بحال رہی۔ آزادی فکر پر کوئی قدغن نہ تھی۔ اس سے ذہن انسانی کی فکری نشوونما کو بڑی مدد ملی۔ سماجی لحاظ سے اس کا فائدہ یہ تھا کہ جب سیاسی طور پر عالم اسلام زوال سے دوچار ہوا، اس وقت بھی برگزیدہ علما، فضلا اور شعرا کی کمی نہ تھی۔ اگر اس زمانے میں تعلیم میں حکومت کا دخل زیادہ ہوتا، اگر تعلیم کو فولادی جیکٹ میں کس دیا جاتا، تو آزادی فکر کی راہیں مسدود ہو کر رہ جاتیں اور سیاسی بدامنی اور انتشار کے ادوار میں مسلمانوں کی فکری زندگی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہتی۔

آزادی پر خارجی دباؤ مضر ہوتا ہے، لیکن داخلی دباؤ اسے ایک نہج عطا کرتا ہے۔ جب تک عباسی دور میں معاشرتی استحکام باقی رہا، دینی نقطۂ نظر کا داخلی دباؤ برقرار رہا۔ جیسے ہی معاشرتی زندگی میں ابتری پھیلی، مختلف علوم کا دینی رنگ بھی ماند پڑتا چلا گیا اور بقول اقبال

"آزادیِ افکار ابلیس کی میراث ہو کر رہ گئی"۔ اس کا فوری اثر دو صورتوں میں سامنے آیا:

(الف) علوم کے باہمی رشتے ٹوٹنے لگے اور مختلف علوم مقصود بالذات ہوتے گئے، حتیٰ کہ نحو، صرف، منطق و امثال ذالک جیسے امدادی علم بھی اپنی الگ حیثیت قائم کرنے لگے۔ ان میں بقول شبلی نعمانی وہ اہتمام اور موشگافیاں ہونے لگیں کہ (مدرسوں اور شاگردوں کی) عمر کا ایک حصہ انھی کی نذر ہو گیا اور جن علوم کی تکمیل مقصود اصلی تھی، ان پر پوری توجہ نہ رہ سکی۔

(ب) سالم زندگی کی بجائے اجزا پر غیر ضروری توجہ کا اثر یہ تھا کہ اصل کتابوں کے مفصل حواشی اور پھر حواشی در حواشی لکھے جانے لگے اور روایت، فکر و نظر کو خام مواد مہیا کرنے پر لگ گئی۔ غور و فکر کے سوتے تقلید کی روش اختیار کرنے سے خشک ہو گئے۔ یہ تقلیدی رجحان بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی سے عام ہونے لگا۔

عباسی سلطنت کے دورِ زوال میں عالم اسلام کے بعض اہم مفکر، شارح، متکلم، فلاسفر طبیب پیدا ہوتے رہے۔ مرکز گریز عناصر کو تعلیم کا پورا رقبہ متاثر کرنے کا موقع نہ ملا اور دنیائے علم کی شادابی قائم رہی۔ زوال کے اثرات صرف محدود طور پر علما و ادبا کے طبقے کو متاثر کر سکے۔

لیکن منگولوں کا حملہ (۱۲۵۸ء) عالم اسلام کے لیے ایک سانحہ تھا جس نے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور مذہبی بنیادوں کو متزلزل کر دیا اور اس کے اثرات صدیوں تک ظاہر ہوتے رہے۔ خاص طور پر تعلیم میں زوال کے عناصر، منگولوں کے حملے اور عباسیوں کے خاتمے سے شدت اختیار کر گئے اور نکبت و نحوست کے سائے پھیل گئے۔

منگولوں کے حملے نے عالم اسلام میں تباہی اور بربادی کی وہ مثال قائم کی جس کی نظیر نہیں ملتی۔ ایران کی آبادی تہ تیغ ہو کر ایک تہائی رہ گئی۔ بغداد کے گلی کوچے کشت و خون کے ہولناک مناظر سے دوچار ہوئے۔ سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ فکر و نظر کے سوتے سوکھ گئے اور اس دورِ زوال نے علم کی وحدت کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا۔ مرکزی ذہنی فکر باقی نہ رہی۔ تقلید نے جامد نقطۂ نظر کو مقبول بنایا۔ اجتہاد کے راستے بند ہو گئے۔ نئی نسلوں نے اکابر کے افکار کو آنکھیں بند کر کے قبول کر لیا۔ جزئیات پرستی پر زیادہ توجہ ہوئی اور شرحوں کے پشتارے لگتے چلے گئے۔ اس سے نئے علوم سے استفادے کا عمل رک گیا۔ لسانی دوری کا

احساس بڑھا۔ نصابات میں فارسی ادب مقصود بالذات قرار پایا۔

عربی علوم میں فلسفے کی موشگافیاں اصل حقائق کی جگہ لینے لگیں۔ دینی موضوعات کو نصاب میں کم سے کم جگہ ملی اور وہ بھی تمرینی طرز کی کتابیں جن سے زبان دانی کے فوائد تو بلا شبہ حاصل ہوئے، لیکن فکر میں بیداری نہ پیدا ہو سکی۔ حد یہ تھی کہ تاریخ کی کتابوں کی تعلیم کا مقصد بھی حقائق کا بیان یا تعبیر نہ تھا، بلکہ ان سے بھی زبان سکھانے کا کام لیا گیا۔ ادب، دین سے الگ ہو کر دنیا داری کے معاملات تک رہ گیا۔ لے دے کر صوفیا کی محفلیں تھیں جن میں روحانی دعوت باقی رہی، لیکن یہ دعوت بھی یک طرفہ تھی۔ اس دعوت سے دنیا خارج ہو چکی تھی، ترک دنیا اور تقدیر پرستی پر زور تھا۔ ظاہر اور باطن ایک دوسرے سے کٹ کر ایک ایسے معاشرے کو سامنے لائے، جس میں فرد کی داخلی زندگی اور خارجی زندگی کے رشتے معدوم تھے۔ جس میں قول و فعل کے درمیان فاصلے تھے، جس میں تمدنی زندگی کے حقائق اور ان کے بارے میں تصورات کے درمیان بعدالمشرقین پیدا ہو چکا تھا۔ وحدت معدوم تھی اور معاشرتی زندگی کے جملہ مظاہر اپنے الگ الگ راستے بنا کر چل رہے تھے۔ اس صورت حال نے برصغیر میں مسلمانوں کے فکر و نظر کو بھی متاثر کیا۔

برصغیر پاک و ہند اگرچہ منگولوں کے حملوں سے براہ راست متاثر نہ تھا، لیکن عالم اسلام کی تباہی، علما و فضلا اور شعرا کی نقل مکانی اور ہندوستان کی طرف مراجعت نے یہاں بھی یہ احساس عام کر دیا تھا کہ دنیا ایک ایسے روحانی اور مادی عذاب میں گرفتار ہو چکی ہے جس کا مداوا فوری طور پر ناممکن ہے۔ بے بسی اور کرب کا احساس برصغیر کے علم و ادب میں صاف نظر آتا ہے۔ تعلیمی نظام نے آغاز کار میں ایران ہی کو اپنا نمونہ بنایا تھا۔ یہاں کی درس گاہوں میں عربی، فارسی کی تدریس کا زور تھا۔ سرکاری انعام و اکرام سے بعض مدرسے جاری ہوئے، بعض مساجد میں درس ہوتے تھے۔ امرا کی حویلیاں بھی اسی نمونے پر ڈھلی ہوئی تھیں، صوفیا کی خانقاہوں میں درباری اثرات زیادہ راہ نہ پا سکے تھے۔ سلسلہ چشتیہ کے صوفیا نے درباروں سے تعاون کو پسند نہ کیا تھا۔ لیکن ان کی تعلیم کی ابتدا بھی دنیاوی علوم سے ہوتی تھی۔ صوفیا کی محفلوں میں تعلیم، روحانی افکار تک محدود تھی۔ تاہم ہر آستانے پر متمکن خلیفہ کے لیے ضروری تھا کہ خلافت کی مسند پر بیٹھنے سے پہلے علوم ظاہری کی تکمیل کرے۔ ظہیر الدین بابر (۱۵۲۶ء) کے حملے کے بعد سے ایران کی گرفت یہاں کے معاشرے پر زیادہ ہو

گئی اور سماجی زندگی کا ناک نقشہ منگولوں کی یورش کے بعد والے ایران کے انداز پر استوار ہوا۔ جس میں معقولات (philosophy) کا پلہ دیگر علوم کے مقابلے میں بھاری تھا۔

برصغیر پاک و ہند میں جو نصاب رائج تھا، اس میں زور دینی علوم کے بجائے زبان و بیان پر ہوا۔ فارسی ایک مدت تک بول چال کی زبان رہ چکی تھی، تغلق عہد (۱۳۲۰ء - ۱۴۱۴ء) تک سرکاری اور درباری زبان کے علاوہ فارسی کا چلن بطور بول چال کی زبان کے جاری رہا۔ لیکن یہ زبان سارے برصغیر میں ایک ہی انداز اور ایک ہی محاورے کی تھی۔ جس پر ماوراء النہر کا اثر خاصا تھا۔ عربی کی حالت یہ تھی کہ سوائے ابتدائی مختصر مدت کے، جب مسلمانوں نے سندھ اور ملتان میں اقتدار حاصل کیا تھا اور بعض عرب چھاؤنیاں قائم ہوئی تھیں، عربی کبھی بھی بول چال کی زبان نہ تھی۔ فارسی ذریعہ تعلیم کے حوالے سے عربی کی تدریس ہوتی رہی۔ تغلق عہد تک آتے آتے مقامی زبانوں کی نشوونما ہونے لگی تھی۔ اب فارسی بھی بول چال کی حد سے نکل کر محض تہذیبی اور ثقافتی، سرکاری اور درباری زبان ہو کر رہ گئی تھی۔

ظہیر الدین بابر کے بعد ایران اور توران سے لوگ بہ کثرت آنے لگے اور درباری فضا کے علاوہ دارالحکومت میں فارسی بول چال کا کسی قدر احیا ہو گیا۔ لیکن وہ لسانی عمل جو مقامی زبانوں میں شروع ہو چکا تھا، اس کے رکنے کی نوبت نہیں آئی۔ مقامی باشندوں کے لیے عربی کی طرح فارسی بھی بدیسی زبان بن گئی۔ عربی، مذہبی زبان اور فارسی ثقافت کی زبان تھی۔ دونوں کی تدریس میں بول چال کی فطری امداد شامل نہ رہی، اس لیے ان کی تدریس غیر ملکی زبانوں کے طور پر ہونے لگی۔ نصاب تعلیم میں نفس مضمون کی جگہ زبان و بیان کے خصائص پر زور ہو گیا۔ بقول شبلی نعمانی، نصابی تصانیف کی کثرت ہوئی اور اس بات سے بھی ضرر پہنچا، پہلے زیادہ تر فن کی تعلیم پر زور ہوتا تھا اب کتابی تعلیم کی بنیاد پڑی، جس میں اصلی مسائل سے زیادہ کتاب کی عبارت اور متعلقات سے بحث ہوتی تھی۔ ہندوستان میں تو ضمیروں کے مرجع اور حیثیت تعلیلی و تقلیدی سے، بُعدیت ذاتی و زمانی کے تنگ دائرے سے طلبہ تو کیا اکثر علما بھی کبھی باہر نہیں نکلے (مقالات شبلی، ج ۳)۔ زبان و بیان پر یہ زور قدرتی تھا تاہم اس سے نصاب اور اس کے نتائج پر گہرا اثر پڑا۔

منگولوں کے حملے کے بعد سے دین اور دنیا کی دوئی تو پہلے ہی پیدا ہو چکی تھی اور نصاب

کے نقطہ نظر میں امتزاجی رجحان کی جگہ الگ الگ خانے بن گئے تھے۔ اب برصغیر میں فارسی کی تدریس میں دینی سرمائے کی جگہ ادبیات نے لے لی تھی اور درس و تدریس کا سارا زور زبان و بیان پر ہو چکا تھا۔ عربی کی تدریس بھی صرف لسانی لحاظ سے ہونے لگی تھی۔ دینیات کی کتابوں کی تعداد گھٹتے گھٹتے نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ اب نصاب فارسی نے پورے نظام تعلیم میں وقت اور کتب کا زیادہ حصہ لے لیا۔ حمید الدین خان (ہسٹری آف مسلم ایجوکیشن، ج ۱) نے ہندستان کے نظام تعلیم میں جن کتب کی تفصیل دی ہے، اس میں فارسی ادب و انشا، شاعری، داستانی ادب اور تاریخ نے نصاب کا زیادہ حصہ دبا رکھا ہے اور اس میں فارسی کی مدد سے دینی تعلیم کے لیے صرف پانچ کتابوں کے نام ملتے ہیں: اخلاق ناصری، اخلاق جلالی، نزہت الارواح، مثنوی معنوی اور حدیقہ سنائی۔ انھی کتب پر سارا دینی نصاب ختم ہو جاتا ہے۔ عربی نصاب ہے تو اس میں بھی تمرینی کتابوں کی پوری کھیپ موجود ہے --- بقول مولانا مناظر احسن گیلانی، "دینیات اور خالص اسلامی علوم میں غفلت بلکہ مجرمانہ غفلت برتی گئی۔ ظاہر ہے پورے نصاب میں چند مختصر فقہی متون کے علاوہ جلالین جیسی تفاسیر اور مشکوٰۃ جیسے مجموعہ حدیث اور ہدایہ اور شرح وقایہ جیسی کتابوں سے ان علوم کے متعلق کیا معلومات فراہم ہو سکتے تھے" (ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، ج ۱)

جو فقہی مسائل و معاملات ان کتب میں بیان ہوئے ہیں، ان کا تعلق زمانہ ماضی سے تھا۔ نئے حالات میں علم کا معاصر حالات پر انطباق نہ تھا۔ ظاہر ہے استاد اگر فقہی مسائل کی تفصیل میں جاتا بھی تھا تو اس کے لیے فرضی واقعات اور فرضی حالات ہی کی مدد سے تمرین ممکن تھی۔ حقیقی زندگی نصاب تعلیم میں خاصی پس منظر میں جا چکی تھی۔ دینی کتب کی محدود تعداد کے علاوہ طریق تدریس میں بھی فرق آ چکا تھا۔ اب مطالب کی جگہ لسانی خصائص نے لے رکھی تھی۔ اس لیے تعلیم کی غایت بدل کر کچھ سے کچھ ہو گئی۔

اکبری دور (۱۵۵۵ء - ۱۶۰۵ء) میں برصغیر ایک نئی صورت حال سے دوچار ہوا۔ ایران میں شیعیت کے فروغ کے باعث فلسفے اور منطق کا زور کم ہوا۔ اکثر علما اور فضلا نے توران اور ہندستان کا رخ کیا۔ معقولات کے سیلاب نے دینی سطح پر ہلچل ڈال دی۔ دین الٰہی جیسی تحریکیں ابھریں۔ حکیم فتح اللہ شیرازی کے توسط سے برصغیر میں معقولات کا چرچا بیش

از بیش ہو گیا۔ نصاب تعلیم میں تدریسی کتب کی جگہ معقولات نے لے لی۔ نصاب کی ثنویت کے بعد یہ دوسری بڑی افتاد تھی جو علوم اسلامیہ پر پڑی۔

اب نحو کی کتاب بھی شرح ملا جامی قرار پائی، جو نحوی مباحث میں عقلیت کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ جب، بقول سید مناظر احسن گیلانی، نحو کی کتاب کا یہ حال ہو تو پھر اصول فقہ یا کلام کی کتابوں میں منطقیت اور عقلیت کی جس حد تک گنجائش پیدا ہو سکتی تھی، ظاہر ہے۔ عنصریات اور کائنات الجو تک کے مباحث تو کلامی کتب میں پہلے ہی شامل ہو چکے تھے، اب نحو اور ادب بھی اس رنگ میں رنگے گئے۔ خود دینی کتب پر یہ اثر ہوا کہ کل تین کتابوں پر قناعت کر لی گئی اور نصاب کا غالب حصہ منطق اور فلسفے پر مشتمل ہو گیا۔ بیضاوی صرف ڈھائی پارے پڑھائی جاتی تھی، خیر آبادی خاندان نے تو اس کو صرف سوا پارے تک کر دیا۔ خالص دینیات میں جلالین قرآن کے لیے، مشکوٰۃ حدیث کے لیے، ہدایہ و شرح وقایہ فقہ کے لیے رہ گئیں۔ باقی جملہ تعلیم یا تو عربی ادب پر مشتمل تھی یا پھر فارسی ادب پر، جس میں دینی رجحان سے متعلق کتاب کی تعداد دو چار سے متجاوز نہ تھی۔ ایسی حالت میں درسیات سے دینی عنصر خارج ہو گیا اور تعلیم خالص فلسفے اور منطق کی تعلیم ہو گئی، جس کا نصب العین آزاد فلسفیانہ فکر تھا۔

ان حالات کا مقابلہ علما کے ایک طبقے نے یوں کیا کہ تعلیمی معاملات میں علم حدیث کے احیا کی کوشش کی، سیرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کتب و رسائل کا وافر ذخیرہ ضبط تحریر میں آیا۔ عبدالحق دہلوی اور مجدد الف ثانی کے حلقہ ہائے ارادت میں عشق رسول کو بڑی اہم جگہ ملی ہے۔ سماجی سطح پر اس احساس نے اسلام کو منتشر ہونے سے بچا لیا۔ درس حدیث اور سیرت رسول ﷺ کے موضوعات نے برصغیر میں اسلام کو انتشار و زوال کے ادوار میں بڑا سہارا دیا۔ دینی احساس نے بیدار رہ کر مسلمانوں کی فکری زندگی میں مستقل عنصر کا درجہ حاصل کیا۔ حتیٰ کہ موجودہ دور کے مسلمان بھی جو دینی زندگی سے دور ہو چکے ہیں، چیلنج کے وقت ان کی غیرت دینی بھی اسی شدت سے بیدار ہوتی ہے، جس شدت سے کسی دین دار مسلمان کی۔ نصاب تعلیم میں سیرت اور حدیث پر زور دے کر مسلمانوں کو الحاد کے چنگل میں پوری طرح چلے جانے سے ایک حد تک بچا لیا گیا۔

اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی میں نصاب تعلیم میں ترمیم کو ضرورت شدت

سے محسوس ہوئی۔ چنانچہ ملا نظام الدین سہالوی اور شاہ ولی اللہ کے گھرانے نے ادھر توجہ کر کے خالص دینی نصاب کے ادارے قائم کر دیے۔ درس نظامی میں پہلی بار ہندستان کے علما کی متعدد کتابیں شامل کی گئی۔ ہر فن کی ان کتابوں کو شریک نصاب کیا گیا، جن سے زیادہ مشکل کتابیں اس فن پر دستیاب نہ تھیں۔ منطق اور فلسفے کی کتابیں دیگر تمام علوم سے زیادہ رکھی گئیں۔ حدیث کی صرف ایک کتاب مشکوٰۃ شامل نصاب تھی، اور ادب کو اس نظام میں سب سے کم اہمیت دی گئی۔ یہ نصاب تعلیم اس بات کا بالواسطہ اظہار تھا کہ دینی علوم تعلیم کے لیے خاص قسم کا نصاب تعلیم اور خاص قسم کے مدرسے ہونے چاہئیں، تاکہ اختصاص کے طالب ہی مدارس دینیہ میں تعلیم حاصل کریں اور عام نصاب تعلیم اپنی جداگانہ ڈگر پر چلتا جائے۔

علامہ شبلی کے نزدیک "درس نظامیہ" کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ اس درس کے ذریعے قوت مطالعہ قوی ہو جائے اور نصاب ختم کرنے کے بعد طالب علم جس فن کی جو کتاب چاہے سمجھ سکے۔ قدیم نصاب کے برخلاف، اس درس سے یہ فائدہ ہوا کہ اگر کوئی طالب علم درس نظامیہ کی کتب کو بغور پڑھ لے تو عربی زبان کی کوئی کتاب اس کے لیے لاینحل نہیں رہتی۔ نصاب کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ اس میں فقہ کی کتابیں کم ہیں اور جو ہیں، ان میں معقولی استدلال سے کام لیا گیا ہے۔ اس لیے اس میں ظاہر پرستی اور تعصب کا رنگ نہیں ہے۔ ان فوائد کے علاوہ ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ برصغیر میں یہ مدرسے الگ الگ دینی کالونیاں بن گئے اور اسلام عام زندگی سے ایک فعال قوت کے طور پر خارج ہوتا گیا۔ دوسرے جس منطق اور جس فلسفے کو اس میں شامل کیا گیا، وہ اپنی افادیت کھو چکا تھا اور حیات و کائنات کے مسائل حل کرنے کی صلاحیت سے عاری ہو چکا تھا۔

خانوادۂ شاہ ولی اللہ کے درسی مسلک میں بھی معقولات کو بہت زیادہ مقبولیت ملی۔ مدرسہ رحیمیہ کو مسلمانوں کی ملی بیداری کا نقطہ آغاز قرار دیا جاتا ہے۔ اس خانوادے کا اہم ملی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے معقولات پر زور کے باوجود فلسفے کا رخ پیچیدہ مابعد الطبیعاتی مسائل سے پھیر کر دینی امور کی طرف کر دیا۔ تقدیر اور دوسرے مسائل پر غور و فکر کی بجائے زندگی کے عملی پہلوؤں پر زیادہ توجہ کی۔ صرف یہی نہیں بلکہ فرضی اور خیالی مسائل سے نکال کر مسلمانوں کو حقیقی مسائل سے آشنا کیا۔ نظریے اور عمل کے درمیان فاصلوں کو مٹایا۔ جہاد کا

صور پھونک کر بیداری کی وہ شمع روشن کی جس نے مسلمانوں میں ترکِ دنیا کی جگہ دنیاوی امور میں دلچسپی لے کر حالات بدلنے کی جدوجہد پر آمادہ کیا۔ عمل اور حرکت کا یہ تصور تعلیمی نظام میں ایک نرالی چیز تھا جس نے ہندی مسلمانوں کو اپنے گرد و پیش کو بدلنے کے عزم سے روشناس کیا۔ اس خانوادے کی تصانیف سے پہلی بار یہ احساس ہوتا ہے کہ مصنفین ایک خاص معاشرے اور خاص زمانے میں سانس لے رہے ہیں جس کے کچھ مخصوص مسائل ہیں اور جن کا حل بھی مطلوب ہے۔

تحریک سرسید ہمارے نظام تعلیم کا ایک نیا موڑ ہے۔ سرسید احمد خان، مولانا اسماعیل شہید کے درس میں شریک ہوا کرتے تھے، اس لیے ان میں تقلید کی بندشوں سے آزاد ہو کر غور و فکر کرنے کی عادت پڑی۔

اس طرح حلقہ ولی الٰہی کے طفیل علم و فکر میں تازہ روی کا پودا سرسید کے ہاتھوں بار آور ہوا۔ سرسید نے جدید علم کلام کی بنیاد ڈالی، لیکن بد قسمتی سے فکری لحاظ سے یہ ایک نئی معتزلہ تحریک کے خدوخال لیے ہوئے تھی، جس میں مغربی افکار خصوصاً سائنسی انکشافات اور مذہب کے درمیان مطابقت کے لیے استدلال پر بھروسا کیا گیا تھا۔ سرسید کے ساتھیوں میں اس نئے علم کلام کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ علم الکلام اور الکلام کی تصنیف بھی اسی فکری جہت کی نمائندگی کرتی ہے، اگرچہ شبلی زیادہ دیر تک سرسید کا ساتھ نہ دے سکے۔ سرسید کی آزاد فکری کچھ تو شاہ اسماعیل شہید کی صحبت کا نتیجہ تھی، اور کچھ اس سلسلۂ خیال کے بزرگ مولوی مملوک علی کی تعلیم کا اثر، جن سے سرسید دہلی کالج کے زمانے میں استفادہ کر چکے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جدوجہد کی ناکامی کے بعد مسلمانوں کی سماجی شیرازہ بندی میں سرسید اور ان کے رفقا نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

دوسری جانب عام دینی طبقے انگریزوں کی سیاسی پالیسی کی وجہ سے مغربی تعلیم اور مغربی اطاعت سے بہت برا فروختہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ جب سرسید نے علی گڑھ کالج کے ذریعے مسلمانوں کو مغربی زبانوں، مغربی علوم اور مغربی سائنس سے متعارف کرانے کی ٹھانی تو اسی دور میں دارالعلوم دیوبند کی بنا پڑی۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ہندی مسلمانوں کے دو الگ الگ گروہ ملتے ہیں جو مختلف دنیاؤں کے باشندے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک طرف خالص دینی تعلیم حاصل کرنے والی

جماعت ہے جو چند برس میں دیو بند سے نکل کر برصغیر کی مساجد میں امامت کی کرسیوں پر متمکن دکھائی دیتی ہے۔ یہ گروہ قرون وسطیٰ کی سماجی زندگی میں سانس لے رہا ہے اور اسے ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں کہ دنیا گول ہے یا چپٹی۔ دوسری طرف مغربی تعلیم حاصل کرنے والی جماعت ہے جسے دین کی خبر نہیں اور مادی زندگی ہی کو سب کچھ جانتی ہے۔ سرسید اور ان کے رفقا نے یہ سمجھا تھا کہ مغربی تعلیم اور مغربی تمدن کو جدا جدا کر کے، مسلمانوں کو صرف جدید تعلیم دے کر، ان کی مذہبی زندگی کو بدستور بحال رکھا جاسکتا ہے۔ سرسید نے علی گڑھ کی فضا کو دینی رکھنے کے لیے جو کچھ کیا، اس سے ان کے خلوص پر یقین آتا ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر افسوس بھی ہوتا کہ ان کی پوری خواہش کے باوجود دین، علی گڑھ کے رگ و پے میں سرایت نہ کر سکا — ممکن ہے اس کا سبب یورپ سے اٹھنے والی مادیت کی آندھی ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ ناکامی کا سبب وہ نظام تعلیم ہو جس کے سرسید داعی تھے۔ انھوں نے علی گڑھ کو مسلمانوں کے لیے ملازمت کے حصول کا ذریعہ بنایا اور ملازمت کے لیے دین کی ضرورت نہ تھی۔ یا پھر یہ سبب ہوسکتا ہے کہ مغربی طرز کے کالج کو مغربی نظام تعلیم کا حصہ بھی ہونا تھا اور اس میں دینی امور کو زیادہ دور تک لے جانا ممکن نہ تھا۔ دینیات کا نصاب علی گڑھ میں ایک زائد مضمون تھا، جس کا تعلق امتحان لینے والی یونیورسٹی کے نصابات سے بالکل نہ تھا۔ دینیات کو پورے مغربی نصاب کی تفصیلات میں سمونے کا عمل ممکن نہ تھا اور یہ سمٹ سمٹا کر ایک مضمون کی چار دیواری میں رہ گیا اور باقی جملہ علوم و مضامین خالص سیکولر رہے۔

جدید نظام تعلیم میں دین کو بحال رکھنے کے لیے، اسے جداگانہ مضمون بنانے کی کوشش الگ یونیورسٹی بننے کے بعد بھی جاری رہی۔ لیکن دین کو ایک گوشے میں ڈال دینے کی رسم کچھ ایسی ضرر رساں ثابت ہوئی کہ اب تک مختلف یونیورسٹیوں میں اسلامیات کی چھوٹی چھوٹی کالونیاں بسی ہوئی ہیں، لیکن ان کے اثر کا حلقہ یونیورسٹی کے دوسرے شعبوں پر معمولی نفوذ رکھنے کا اہل بھی نہیں ہوسکا۔ سرسید نے نوجوانوں کو دین کے قریب رکھ کر، مغربی علوم سے واقف کرانے کا جو منصوبہ بنایا تھا، اس کا پہلا حصہ ناکام ہو گیا۔

ان کے مقابلے میں شبلی نے "دارالعلوم ندوہ" کو آباد کیا کہ وہ دنیوی کام طبقۂ علما میں کیا جائے جو سرسید نوجوانوں کے سلسلے میں کر رہے تھے۔۔۔ علما کو جدیدیت سے

آشنا نہ کرایا جاسکا اور نوجوان دین سے نا آشنا رہے۔ مسلمان معاشرے کی دولخت زندگی دو انتہاؤں کے درمیان معلق رہی۔ مولوی سمیع اللہ نے سرسید سے روٹھ کر الٰہ آباد یونیورسٹی کے زیر سایہ ایک ہوسٹل کی بنیاد رکھی اور اس کے انتظام میں دین کو زندہ رکھنے کی سعی کی۔ دین کو جزوی طور پر برقرار رکھنے کی یہ ساری کوششیں اپنے مقصد میں ناکام رہیں کیونکہ ان کی تہ میں یہ احساس تھا کہ دین الگ چیز ہے اور دنیا الگ، اور دین کو فرد کے ذاتی فعل کے طور پر زندہ رکھنا کافی ہوگا۔ ملت اسلامیہ کے دو گروہ ایک دوسرے کے حالات سے تقریباً بے خبر، ایک ہی دنیا میں رہتے ہوئے دو الگ الگ براعظموں کے باشندے معلوم ہوتے ہیں جن میں اتصال وارتباط کا کوئی زاویہ موجود نہیں۔

دین و دنیا کی یہ علاحدگی برطانوی دور کے مسلمانوں کی فکری زندگی کا عظیم سانحہ ہے۔ برصغیر کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے مکتب، طالب علموں کی تربیت کرتے رہے، جن کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی تھی۔ لیکن یہ طبقہ معاشرتی زندگی میں کوئی آبرومندانہ مرتبہ حاصل نہ کرسکا اور "ملا" کی اصطلاح فکری پسماندگی، کورانہ تقلید اور علوم دنیوی سے بیگانگی کا استعارہ بن کررہ گئی۔ حق یہ ہے کہ دینی مدرسوں کے فارغ التحصیل، زندگی کی تگ و دو میں بہت پیچھے رہ گئے اور مسلمانوں کی رہنمائی کا اہم فرض ادا نہ کرپائے۔ مغربی طرز کی درس گاہوں کے تعلیم یافتہ دین سے بیگانہ محض رہے اور مادی زندگی کی دوڑ میں "چنگیزیت" کی حدوں کو چھونے لگے۔ مغربی درس گاہوں کا نظام تعلیم اسلامیات کو صرف ایک جزیرے کے طور پر برداشت کرنے کو تیار تھا۔ انگریزی کی برتری، مستشرقین کے گروہ کی ناکامی اور انگریزی کے پرستاروں کی کامیابی سے مشرقی علوم کی ناقدری کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ اسکول میں عربی، فارسی اور دینیات کا استاد ایک گھٹیا مخلوق سمجھا جانے لگا۔ کالجوں میں بھی مشرقی علوم کے اساتذہ کی حالت مختلف نہ تھی۔ تنخواہ، اہمیت اور اعزاز کے اعتبار سے یہ استاد حقیر گردانے گئے۔ اس فضا میں استاد کی عزت بھی گئی، دین بھی گیا اور دنیا بھی جاتی رہی۔

اسلامیہ کالجوں میں دینیات کی تعلیم محض زبانی جمع خرچ تھی، کیونکہ اس تدریس کا نظام امتحان سے کوئی تعلق نہ تھا۔ پاکستان بننے کے بعد سرکاری کالجوں اور مدرسوں میں اسلامیات کا مضمون رائج ہوا اور اسلام کی خیر خواہی کے بڑے بڑے دعوے ہوئے۔ اب تو اسکول کے درجوں میں یہ لازمی مضمون بھی ہے، لیکن اس مضمون کے نصابات نہ تو نئی

ضرورتوں سے ہم آہنگ ہیں اور نہ انھیں پورے نظام تعلیم میں کوئی رسوخ حاصل ہے کہ پورے نظام کو متاثر کرسکیں۔

۳

پاکستان کو اپنے یوم تاسیس ہی سے اپنی بقا کا امتحان درپیش ہے۔ قیام پاکستان کے بعد سے اسلام کا زبانی بہت چرچا رہا لیکن عملاً ملک کی آبادی میں اس کا سراغ نہیں ملتا، بقول علامہ اقبال

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

سیاسی حالات اور سماجی تغیرات نے مقاصد اور اصل زندگی کے درمیان فاصلہ پیدا کر دیا ہے۔ ہم جو ذہنی زندگی بسر کرتے ہیں، وہ اسلام کو آدرش مانتی ہے اور کاروبار حیات میں جو اصول کارفرما ہیں، وہ یورپ کے عام باشندے کے خیالات سے الگ نہیں۔ منافقت کا یہ پھیلاؤ تعلیمی نظام کو بھی متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ نصابی اور کتابی طور پر اسلام کو موثر حقیقت بنانا جبھی ممکن ہے کہ عملی طور پر بھی یہ تجربات ہماری زندگی کا حصہ ہو جائیں۔ یہ خیال کرنا کہ نظام تعلیم کو بدل دینے سے اور اس میں اسلام کو مؤثر عنصر کے طور پر شریک کر دینے سے معاشرتی اصلاح ہو جائے گی اور یہی اقدام کافی ہو گا، کسی طور بھی درست نہیں۔

بعض ماہرین تعلیم کا یہ خیال ہے کہ "صرف تعلیم کا نظام درست ہو جائے تو ہمارے سارے قومی دلدر دور ہو جائیں گے"۔ میرے خیال میں یہ کہہ کر ہم خوش فہمی کی جنت میں سانس لیتے ہیں۔ صرف تعلیم سے پورے معاشرے کی اصلاح ممکن نہیں۔ اصلاح کا عمل سماجی زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی کرنا ہو گا۔ معاشرہ ایک طرف جا رہا ہو اور تعلیم کو دوسری طرف لے جا کر ہم اس داخلی تضاد کو اور زیادہ ابھاریں گے جس سے ہمارا ملک دوچار ہے۔ ایسی صورت میں تعلیمی اصلاحات سے کامیابی تو در کنار، ابتری پھیلنے کا اندیشہ ہے اور اس کے نتائج تعلیمی حدود سے باہر بھی محسوس کیے جا سکیں گے۔ یہ عام دستور ہو گیا ہے کہ معاشرے کی ساری خرابیوں کو جمع کر کے استاد کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا

ہے۔ طالب علم استاد کے پاس ۲۴ گھنٹوں میں چھ سات گھنٹے سے زیادہ نہیں ہوتا۔ آخر والدین، معاشرے اور حکومت کے دوسرے شعبوں کی بھی تو کوئی ذمہ داری ہو گی!

استاد کو معاشرے نے کیا مقام دے رکھا ہے کہ طالب علم استاد کو اپنا آئیڈیل بنا سکے اور کاروبار حیات میں اس کی رہنمائی پر فخر کرے۔ سارے معاشرے کی غلاظت کو استاد کے منہ پر مل دینے سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ جب ہر طرف منافقت کا بازار گرم ہو تو استاد بھی آخر اسی معاشرے کا حصہ ہے۔ استاد فرشتہ نہیں، انسان ہے۔ منافقت کی فضا میں اس لیے تو اب یہ بھی ممکن نہیں رہا کہ شاگرد کو مقاصد کی طرف راغب کرنے کے لیے اس کی داخلی صلاحیتوں کو ابھار سکے اور ترغیبات کے ذریعے اسے حصول علم کے لیے آمادہ کر سکے کیونکہ ترغیبات کے راستے میں معاشرتی ابتری کی گہری خلیج حائل ہے۔

معاشرے اور تعلیم کے درمیان بھی مفادات کی ایک دنیار کاوٹ ڈال رہی ہے۔ آج استاد بھی "ٹریڈ یونینسٹ" ہو چکا ہے اور شاگرد بھی۔ یہ سبق تعلیم سے نہیں باہر کی فضا سے انھیں مل رہا ہے، اس میں بھلا استاد کا کیا قصور۔ یاد رہے کہ تعلیم سماجی زندگی کا صرف ایک شعبہ ہے۔ ملک میں معاشرتی توازن کی بحالی کے لیے دوسرے دوائر میں بھی مؤثر اقدامات کی ضرورت ہے۔ ان سب کے مجموعی عمل ہی سے ایک صحت مند معاشرہ قائم ہو سکتا ہے۔ تعلیم آئیڈیالوجی کا صرف ایک حد تک ہی اظہار کر سکتی ہے، باقی کام اہلِ مدرسہ کا نہیں، اہل سیاست، ارباب حکومت، ماہرین اقتصادیات، صحافیوں، شاعروں اور ادیبوں کے کرنے کا ہے۔ تعلیم میں آئیڈیالوجی کے اظہار کے بعد عمل کی باری آتی ہے اور اس میں پورے معاشرے میں تعاون، ہمدردانہ نقطۂ نظر اور متوازن رویے سے سماجی زندگی کے بکھرے ہوئے شیرازے کو مرتب کرنا ہو گا۔

اس گزارش کا مطلب یہ ہے کہ تعلیم میں اصلاح کیجیے لیکن یاد رکھیے کہ یہ کھل جا سم سم کا عمل نہیں ہے، صرف تعلیم پورے معاشرے کی اصلاح کی ضمانت نہیں دے سکتی۔ آپ سارے معاشرے کو درست کیجیے، استاد بھی فرض شناس ہو جائے گا اور شاگرد بھی، فی الحال اس سے زیادہ کی توقع نہ کیجئے۔ تعلیم کے لیے ایک صحت مند سماجی فضا مہیا کرنا اشد ضروری ہے۔ سبھی ادارے یہ فضا بنائیں۔ تعلیم کے ماہرین نیک فضا میں رہیں گے تو وہ بھی نیک ہو جائیں گے۔ آپ آزما کر تو دیکھیے۔

تعلیم سے حاصل ہونے والے جزوی مقاصد کے پورا کرنے کی کیا تدبیر ہو؟ پاکستان میں تعلیم کا نصب العین کیا ہو؟ مطالعہ قرآن سے کون کون سے بنیادی فکری رویے متعین ہوتے ہیں اور اسلام کی سماجی تاریخ میں ان کو کس طرح بروئے کار لایا گیا تھا؟ ہمارے موجودہ مسائل کیا ہیں؟ اور ماضی، حال اور مستقبل کے لیے کیا لائحہ عمل ممکن ہے؟ یہ سارے سوال ایک ہی مرکزی جہت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ پاکستان میں تعلیم کا مسئلہ کن بنیادی نکات کے حل پر منحصر ہے؟ پاکستان کے نظام تعلیم میں پیش نظر مسائل تین بنیادی حقائق سے متعلق ہیں:

- دنیاوی علوم کی تدریس کس زاویے سے کی جائے۔
- دینی علوم کی تدریس کا طریق کار کیا ہو۔
- دین و دنیا کو کس طرح باہم مربوط کیا جائے۔

یعنی اصل مسئلہ تعلیم سے دوئی کو مٹانے کا ہے۔ سائنسی مضامین اور سماجی علوم اور ادبیات کو مقصود بالذات رکھنا ممکن نہ ہوگا۔ جملہ مضامین کو ایک کل کے طور پر لینا ہوگا، تاکہ ان سے ایک فکری وحدت پیدا ہوسکے اور اس کا کل مرجع دینی نقطۂ نظر کی شناخت پر منحصر ہو۔ مادی زندگی کے فیوض و برکات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مشاہدے، تجربے اور تجزیے کا رخ مادی حقائق سے روحانی زندگی کی طرف موڑنا ہوگا۔ گویا فکری وحدت کو اعلیٰ تر مقصد کے حصول کے لیے استعمال کرنا ہوگا۔ اس سلسلے میں دین اور دنیا کی تقسیم ایک خطرناک رجحان ہے۔ مادی اور روحانی زندگی ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں، انھیں ایک کل کے طور پر قبول کرنا ہوگا۔ روحانی اور اخلاقی اقدار باہم مربوط ہیں۔

قرآن کی رو سے یہ اقدار اضافی نہیں اور نہ زمانی حالات کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں، بلکہ یہ دائمی ہیں اور انھیں ہر زمانے اور معاشرتی زندگی کے ہر مرحلے میں مؤثر عنصر کے طور پر بحال رکھنا ہوگا۔ جملہ علوم اسی مرکزی نقطہ ارتکاز کے گرد مرتب ہوں گے۔ بقول اقبال، علم کی تہ میں کام کرنے والی طبعی قوت کو دین کے تابع کرنا ہوگا۔ مولانا روم نے علم کی غایت بیان کرتے ہوئے بڑی پتے کی بات کہی ہے، فرماتے ہیں:

علم را برتن زنی مارے بود
علم را برجاں زنی یارے بود

اقبال نے قرآن حکیم کی روشنی میں علم کا مطمع نظر ان الفاظ میں بتایا ہے۔

علم را مقصود اگر باشد نظر ‏ می شود ہم جادہ و ہم راہبر
علم تفسیر جہان رنگ و بو ‏ دیدہ و دل پرورش گیرد ازو
برمقام جذب و شوق آرد ترا ‏ باز چوں جبریل بگزارد ترا

شیخ مکتب ہے اک عمارت گر ‏ جس کی صنعت ہے روح انسانی
نکتہ دلپذیر تیرے لیے ‏ کہہ گیا ہے حکیم قاآنی
پیش خورشید برمکش دیوار ‏ خواہی ار صحن خانہ نورانی

امور دنیوی کے وسیلے سے امور دینی کی بازیافت کا یہ عمل جبھی انجام پاسکتا ہے۔

۱۹۴۷ء سے اب تک جتنے تعلیمی کمیشن بیٹھے ان میں سے ہر ایک نے اس کا برملا اقرار کیا کہ پاکستان کی نظریاتی ریاست میں نظام تعلیم میں اسلام کو ایک موثر رول ادا کرنا ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان رپورٹوں کے تمہیدی پیراگرافوں اور متون کے درمیان کبھی کوئی مضبوط معنوی ربط پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ بلند بانگ دعووں کے ذریعے تعلیمی اصلاحات کے نفاذ پر زور صرف کیا جاتا ہے۔ لیکن نصابات کی تدوین میں اصولی نقطۂ نظر کی بحالی کو بوجوہ اہمیت نہیں دی جاتی۔

تعلیمی نظام کی کوئی سی صورت بھی فی نفسہ نہ اسلامی ہے نہ غیر اسلامی، چاہے وہ میٹرک، ایف اے، بی اے اور ایم اے کی مدت ہو یا تدریس کی کمی بیشی، یک سالہ اور دو سالہ طریق امتحان کا اجرا اور سمسٹر نظام کا نفاذ ہو--- نظام تعلیم کی یہ ساری تفصیلی شکلیں (جن میں ثانوی تعلیمی بورڈوں اور درس گاہوں میں داخلی جانچ کے طریقوں کو اپنایا گیا ہے اور ایم اے کے درجوں میں میقاتی نظام جاری ہوا ہے) اس بنیادی احساس کا نتیجہ ہیں کہ پرانا برطانوی طرز امتحان اس حد تک ناقص ہو گیا ہے کہ اب اس میں اصلاح کے ذریعے کسی خیر کا امکان نہیں رہا۔ اس لیے پرانے طریقہ تعلیم و امتحان کو رد کر کے نیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ پہلا نظام برطانیہ کی پیروی میں تھا، نیا نظام امریکہ کی تقلید میں ہے۔

بہرحال اخذ و اختیار کا ہر عمل مسلمانوں کی سماجی تاریخ کی تجربہ گاہ سے ثابت ہے۔

اس کی روشنی میں تعلیم کا کوئی سا نظام بھی اپنایا جا سکتا ہے۔ اس کی ممانعت نہیں۔ ہر دستور اسلامی ہو گا، بشرطیکہ بنیادی اصولوں کو عملی صورت دینے کی تدبیر کی جائے۔ زمان سے مکان کا یہ سفر اگر بنیادی فکری جہت کی روشنی میں متعین ہو تو اس کا نفاذ درست ہو گا۔ نیا نظام تعلیم اسلام کو ایک زندہ حقیقت کے طور پر قبول کر لے اور تعلیمی مطمح نظر میں اسے محض آرائش کی چیز نہ جانے، بلکہ عملی طور پر اختیار کرنے کی خواہش کرے تو پھر ایسا نظام تعلیم اسلامی ہی کہلائے گا۔

بیسویں صدی میں سائنسی ترقی نے دنیا کی حدود مختصر کر دی ہیں۔ فاصلے کم ہو گئے ہیں۔ مختلف سماجی عناصر کا عمل تیز رفتار ہے۔ دنیائے علم میں نئے نئے نظریے، نئے نئے فکری پیمانے اور تعلیم و تعلم کے طریقوں میں نئی نئی اختراعات نے آج کے انسان کو ایک ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے، جہاں اعتقادات اور مادی افکار کے درمیان تصادم کی حالت ہے۔ انسان معلومات کے سمندر میں غلطاں ہے۔ علم کی حدود پھیل گئی ہیں۔ علوم کی تعداد بڑھ چکی ہے۔ مادی زندگی نے سرعت کے ساتھ ترقی کے مراحل طے کیے ہیں۔ نئی نئی ایجادات نے انسان کے رہنے سہنے کے طریقوں ہی کو نہیں بدلا، اس کی پوری سوچ کا انداز بھی بدل دیا ہے۔ ان حالات میں انسانی معاشرہ نفع پرستی (pragmaticism) میں مبتلا ہو چکا ہے۔ عالم اسلام میں کئی نئے سماجی اور سیاسی تصورات پھیلتے جا رہے ہیں۔ یہ سوال کہ آیا اقدار اضافی چیز ہیں یا ان کا کوئی حصہ ایسا بھی ہے جسے مستقل اور دائمی قرار دیا جائے، اہم ہے۔

یورپ سے اٹھنے والے سیاسی دبستان ہائے فکر اخلاقی اصولوں سے کنارہ کش ہیں۔ مذہب کے بارے میں عام روش یہ ہے کہ انجیل کے الفاظ ہیں، "سیزر کے معاملات سیزر کے ساتھ اور خدا کے خدا کے ساتھ" --- عیسائیت نے مذہب کو فرد کی ذاتی چیز کے طور پر تسلیم کر لیا ہے اور مذہبی اقدار، عام سماجی زندگی اور اس کے جملہ مسائل سے نکل گئی ہیں۔ ان اقدار کے بارے میں یہ رویہ مضمر ہے کہ جملہ اقدار حیات اضافی ہیں، ان کی کوئی دائمی اور مستقل حیثیت نہیں ہے۔

ایسے میں عالم اسلام کے لیے ایک لمحہ فکریہ ہے۔ کیا اسلام بھی دوسرے مذاہب کی طرح ایک مذہب ہے؟ کیا مذہب کا کام صرف فرد کی داخلی زندگی کی تکمیل ہے یا یہ ایک

ضابطہ حیات بھی ہے، جسے پوری کائنات میں زندگی کی حقیقت کے طور پر قبول کرنا ہوگا؟ کیا قرآن کی رو سے ایسی اقدار بھی ہیں جو دائمی ہوں؟ یہ سوال نئے نظام تعلیم کے لیے بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔

دین و دنیا، روح اور مادہ اور ظاہر و باطن کو ایک ناقابل تقسیم اکائی تسلیم کرنے کے بعد اسلام اور دیگر مذاہب کے بنیادی فرق کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ تعلیمی نظام میں وحدت کی تلاش کا بنیادی اور مرکزی نقطہ اس اقرار پر منحصر ہے کہ روحانی اور اخلاقی اقدار، دائمی اقدار ہیں اور انھیں پورے نظام میں ایک مؤثر عنصر کے طور بحال رکھنا ہوگا۔ ہماری جملہ تعلیمی ضروریات کو اسی مرکزی نقطۂ ارتکاز کے گرد ترتیب دینا ہوگا۔ مادی زندگی کے فیوض اور برکات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مشاہدے، تجربے اور تجزیے کا رخ مادی زندگی سے روحانی زندگی کی طرف کرنا پڑے گا۔

نصابات کی ترتیب و تدوین میں مواد کا منتہا و مقصود، جملہ علوم کو ایک وحدت میں منتقل کرنے کے ساتھ دینی نقطۂ نظر کی بازیافت بھی ہے۔ مضامین کو مقصود بالذات بنانے کی بجائے انھیں ایک واضح فکری نصب العین کے تابع کرنا بھی ضروری ہے۔ نیز جملہ علوم کے درمیان ذہنی و علمی اشتراک کی جو راہیں ہیں، انھیں بھی بروئے کار لانا ہوگا تا کہ انسانی شخصیت کی نشوونما میں یہ علوم الگ الگ خانوں میں بٹ کر طالب علموں کے ذہنی افق میں انتشار کا باعث نہ بنیں اور پورا نظام تعلیم ایک کل کی صورت میں مشخص و معین ہو جائے۔

دور حاضر میں اختصاص کی روش ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ دنیائے علم کے رقبے وسیع ہو جانے سے کسی فرد واحد کے لیے جملہ علوم کو حاصل کرنا یا ان سے جزوی استفادہ کرنا بھی ممکن نہیں رہا۔ اس لیے کل کے مقابلے میں اجزا کی اپنی حیثیت اہم ہو گئی ہے، لیکن اگر علوم کے باہمی رشتوں پر زور دیا جائے گا تو اس وحدت کو عملی شکل اختیار کرنے میں دقت نہ ہوگی جو انسانی ذہن کی تکمیلی منزل ہے۔

فرد کی خارجی اور داخلی زندگی میں فاصلے پیدا ہو چکے ہیں۔ عقیدے اور عمل کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔ اس انتشار کے سماجی اسباب بھی ہیں لیکن ان کے علاوہ یہ فکری سبب بھی ہے کہ زندگی کو بطور کل دیکھنا ترک ہو گیا ہے۔ کل اور جز کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ جب تک نظام تعلیم میں فکری وحدت کو بحال نہیں کیا جاتا، تعلیم سے بھرپور فائدہ اٹھانا ممکن نہیں۔ علم بھی

حقیقت کا صرف جزوی ادراک دیتا ہے، پوری حقیقت کو بیک وقت منشکل کرنے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ حقیقت کے کلی ادراک کے لیے ضروری ہے کہ جملہ علوم انسانی ذہن میں اکائی بنائیں۔

اس بنیادی سوال کے گرد موجودہ حالات کی روشنی میں کئی دوسرے مسائل گھومتے ہیں:

- علوم کی درجہ بندی کیسے ہو؟ نصاب تعلیم میں کس مضمون کو زیادہ اہمیت دی جائے اور کسے کم توجہ کا مستحق قرار دیا جائے؟ کون سا مضمون لازمی ہو کون سا مضمون اختیاری ہو؟ سائنس کی اہمیت دور حاضر میں بڑھ چکی ہے، اس میں اور سماجی علوم میں مطالعے کی کیا نسبت ہو؟ سماجی علوم اور ادبیات کی درجہ بندی کیسے کی جائے؟ مشرقی زبانوں اور فنونِ لطیفہ کو کیا مقام حاصل ہو؟
- دینی علوم کو دیگر علوم کے مقابلے میں کیا اہمیت دی جائے؟ پورے نصاب میں دینی علوم کو کتنی جگہ ملے؟ کیا دینی علوم کو جداگانہ مضمون کے طور پر پڑھانا مفید ہے یا دیگر مضامین کے تاروپود میں اسے ایک فکری جہت کے طور پر سمو دیا جائے۔ قرآنی تعلیمات میں اختصاص کی کیا صورت ہو؟ سائنسی علوم کے ساتھ دین کا رشتہ کن مقامات و مباحث پر استوار ہو؟ دینی مدرسوں اور جدید تعلیمی اداروں کے درمیان ہم آہنگی کے لیے کیا لائحہ عمل اختیار کیا جائے؟
- ذریعہ تعلیم کون سی زبان ہو؟ تعلیم قومی زبان میں ہو یا علاقائی زبانوں میں؟

یہ سہ گانہ مسائل ایسے ہیں جن کے حل پر ہمارے نظام تعلیم کی کامیابی کا انحصار ہے۔

سب سے زیادہ الجھا ہوا مسئلہ زبانوں کا ہے۔

گزشتہ صفحات میں زبانوں کے بارے میں مسلمانوں کے رویے سے بحث ہو چکی ہے۔ زبانوں کے بارے میں مسلمانوں کا نقطۂ نظر یہ رہا ہے کہ اپنی پوری تاریخ میں انھوں نے لسانی عصبیت سے کبھی کام نہیں لیا۔ صرف و نحو کی تدوین، لسانی تشکیلات کا مطالعہ، تخلیقی عمل اور زبان کا باہمی ربط، اور ابلاغ کے جملہ ذرائع میں زبان کی اہمیت کو تسلیم ہی نہیں کیا گیا، اس کے تفصیلی مطالعے کو بھی اہم سمجھا گیا۔ ان کے ہاں زبانوں کا مطالعہ عصبیت کے حوالے سے نہیں ہوا بلکہ زبان کو ذریعہ سمجھا گیا، مقصد نہیں بنایا گیا۔ زبان

سے محبت فطری اور نفسیاتی فعل ہے، اسی طرح ملک سے محبت بھی ایک نفسیاتی فعل ہے۔ لیکن بقول اقبال اسلام سے دونوں کا تصادم، اس وقت ہوتا ہے جب یہ زندگی کا اصل اصول بننے کی کوشش کرتے ہیں اور اسلام کے مقابلے میں ایک الگ قوت ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں ان کی حیثیت ایک بت کی ہو جاتی ہے۔ اس طرز استدلال کی رو سے "مادری زبان" اور "مادر وطن" کی اصطلاحیں ایک خطرناک ذہنی رجحان کی خبر دیتی ہیں، حالانکہ زبان اظہار کا وسیلہ ہے اور اس کی اصل اہمیت ان خیالات و افکار کی وجہ سے ہے جو زبان کے ذریعے بیان کیے جائیں۔

عالم اسلام کی سماجی تاریخ ظاہر کرتی ہے کہ عرب سے نکل کر عجم اور عجم سے وسط ایشیا بلکہ چین تک اور برصغیر پاک و ہند تک اور پھر مغرب میں سپین تک، اسلام کے فروغ کے ساتھ ساتھ ان خطوں کی زبانوں سے مسلمانوں کو سابقہ پڑتا رہا اور ذریعہ تعلیم کے لیے سبھی زبانوں سے کام لیا جاتا رہا۔ اس مسئلے کے حل کے لیے لسانی درجہ بندی کا اصول سماجی سانچے کے اندر سے برآمد ہوا۔ عربی کو دینی زبان کی حیثیت سے ایک خاص مقام اور مقدس درجہ حاصل تھا۔ فارسی نے ثقافتی زبان کے طور عالم اسلام میں اپنی اہمیت کو برقرار رکھا۔ اس کے بعد تیسرے نمبر پر ہر ملک کی زبان کی باری آئی۔ پھر مقامی ضرورتوں کے تحت جابجا اسلامی تعلیمات کو عوام میں علاقائی زبانوں ہی کے ذریعے پیش کیا گیا۔ اس تناظر میں زبانوں کا مسئلہ کبھی سیاسی یا سماجی مسئلہ نہیں بنا۔

قومیت کے مغربی تصورات نے پہلی بار لسانی وحدت کو اصل اصول کے طور پر پیش کیا۔ لسانی عصبیتیں قومی عصبیتوں کے ساتھ ساتھ پھیلتی گئیں اور پھر یورپ سے قومیت کے تصورات کے ہمراہ لسانی عصبیتوں کا چرچا دوسرے خطوں میں بھی ہوا۔ اشتراکی ملکوں میں قوموں کے ساتھ قومیتوں کا تصور بھی پیدا ہوا۔ اس تصور نے علاقائی اور مقامی ثقافتوں ہی کو نہیں مقامی زبانوں کو بھی حربے کے طور پر استعمال کیا۔

پاکستان میں بھی لسانی مسائل کا بیش تر الجھاؤ، ہر دو نظام ہائے فکر (قوم اور اشتراکی قومیت) کے وسیلے سے ہوا ہے۔ لسانی درجہ بندی کا اصول، پس منظر میں چلا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد سے زبان کے مسئلے کو حل کرنے کی کوئی ذمہ دارانہ کوشش نہیں ہوئی۔ علاقائی زبانوں کا مسئلہ مسلسل حل طلب چلا آتا ہے۔ مرکز اور صوبوں کے درمیان حقوق کی

جنگ نے علاقائی مفادات کو ہوا دی اور زبانوں کا مسئلہ مزید الجھ کر رہ گیا۔ علاقائی مفادات علاقائی عصبیتوں کی صورت میں رونما ہوئے۔ علاقائی عصبیت، علاقہ پرستی اور لسانی تعصب کی صورت میں ذہنی انتشار کا یہ عمل بعض مخصوص سماجی فلسفوں کی پیداوار بھی ہے اور مختلف سیاسی، سماجی اور اقتصادی عوامل کا نتیجہ بھی۔

اردو کسی علاقے میں بول چال کی زبان نہیں۔ لیکن عملاً مختلف صوبوں کے درمیان رابطے کی زبان ہے۔ برطانوی دور سے انگریزی ذریعہ تعلیم چلی آتی ہے، جو ایک غیر ملکی زبان نیز سابق حاکموں کے استعماری عزائم کی علامت بھی ہے۔ ارباب اختیار نے اسے ثقافتی مقام دے رکھا ہے اور انتظامی مشینری کی پشت پناہی سے اس کو مزید استحکام مل رہا ہے۔ دوسری طرف مختلف صوبوں میں مقامی زبانوں پر خاص توجہ ہو رہی ہے۔ ان زبانوں کے ادب اور علمی سرمائے کی بازیافت کی حوصلہ افزائی مقامی مفادات، ابلاغ عامہ کے ذرائع، اور سرکاری سرپرستی سے ہوئی۔

یہ حوصلہ افزائی اس احساس کا نتیجہ تھی کہ ماضی میں علاقائی زبانوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا گیا۔ مرکز گریز عناصر نے اس حوصلہ افزائی سے عصبیتوں کا تاج محل بھی تعمیر کیا۔ اردو کو پاکستان میں ایک نئی تہذیبی صورت حال کا سامنا ہے۔ ماضی میں اسے پاکستان کی قومی زبان تجویز کیا گیا۔ اس کے خلاف مشرقی پاکستان سے آواز اٹھی۔ پھر پاکستان کی دو قومی زبانیں (اردو اور بنگلہ) قرار پائیں۔ پھر سقوط مشرقی پاکستان (دسمبر ۱۹۷۱ء) کے بعد سے لسانی مسئلہ مغربی پاکستان کے صوبوں کا مسئلہ ہو چکا ہے۔ مجموعی طور پر سوچا جائے تو تقسیم برصغیر کے بعد قومی زبان کا حل دراصل ملتوی کیا جاتا رہا ہے۔ اردو کا آغاز اسی سرزمین سے ہوا، لیکن لسانی ارتقا کے نمایاں ادوار میں اس کا گہوارہ دلی اور لکھنو کے مراکز تھے اور انھی خطوں میں اردو بول چال کی زبان تھی۔ تقسیم کے بعد ان علاقوں کے باشندے ہجرت کر کے پاکستان میں آئے۔ نوواردوں کو مقامی معاشرتی فضا میں جذب ہونے میں دیر لگی۔ اس سے سماجی، سیاسی اور اقتصادی سطح پر کئی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔ لسانی مسائل بھی الجھ گئے اور اردو کے مقابلے میں مقامی زبانوں کی حوصلہ افزائی کے پیچھے بھی سیاسی مفادات کی سرد جنگ جاری ہوئی۔ وہ عمل جسے پوری قوم کو ایک واحد ملت میں منتقل کرنا تھا، رک سا گیا۔

حصولِ پاکستان کے بعد تعمیر پاکستان کی نوبت نہ آئی۔ واضح نصب العین کی غیر

موجودگی میں مسائل زبان الجھ گئے۔ لسانی درجہ بندی کا اصول اگر بروئے کار نہیں آتا تو مستقبل میں زبانوں کا نزاع خطرناک صورت بھی اختیار کر سکتا ہے۔ سابق مشرقی پاکستان میں لسانی تحریکوں نے جو کردار ادا کیا ہے، اس کی روشنی میں ہمیں انگریزی کو خیر باد کہہ کر داخلی سطح پر جلد از جلد لسانی مسائل کے تصفیے کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ اگر پاکستان کا استحکام مقصود ہے تو ملکی اور صوبائی سطح پر زبانوں کی درجہ بندی کا کوئی نہ کوئی فارمولا بہرحال وضع کرنا ہو گا، کیونکہ یہ مسئلہ اب زبان کی حدود سے نکل کر زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر بھی اثر انداز ہو رہا ہے۔

نظام تعلیم کے حوالے سے "مادری زبان" کا مسئلہ اٹھایا جاتا ہے، لیکن اصل مسئلہ مختلف صوبوں کے درمیان رابطے کا ہے، مادری تعصبات کا نہیں۔ اگر کسی صوبے کی زبان بھی (چاہے وہ اکثریتی صوبہ ہی کیوں نہ ہو) باقی صوبوں کے لیے قومی سطح پر قابل قبول نہیں تو پھر اس کا حل وہی زبان ہو گی، جو صوبوں میں یکساں طور پر سمجھی جاتی ہو، اور ظاہر ہے اور وہ انگریزی نہیں ہو سکتی۔ صوبائی سطح پر علاقائی زبانوں کو پوری طرح نشوونما کا حق ہے۔ علاقائی کلچر اور علاقائی زبانوں کو بنیاد بنایا جائے تو پھر صوبوں کے باشندوں کو صوبائی سطح پر ایک زبان اور ملکی سطح پر دوسری زبان قبول کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

اس حالت کو نظام تعلیم کے حوالے سے دیکھا جائے تو ابتدائی درجوں میں آج بھی مضامین کی تدریس عملاً علاقائی زبانوں ہی میں ہو رہی ہے۔ لیکن تعلیم کے اعلیٰ درجوں میں بعض مضامین میں اردو ذریعہ تعلیم ہے، بعض میں انگریزی۔ انگریزی اور اردو کی یہ دو عملی، تعلیمی نظام کے لیے بڑی تشویش ناک ہے۔ اس کے نتائج خاصے تباہ کن ثابت ہو رہے ہیں۔ ملکی سالمیت کی خاطر یہ فیصلہ کرنا ضروری ہے کہ مستقبل میں کون سی زبان قومی ہو گی۔ صوبوں کی سطح پر اعلیٰ درجوں تک اگر ذریعہ تعلیم مقامی زبانیں بنتی ہیں، تو پھر ان کے اور قومی زبان کے درمیان کوئی قابل عمل فارمولا وضع کرنا ہو گا۔ یہ حل اس بات پر منحصر ہے کہ مرکز میں کس زبان کو قومی سطح پر قبول کیا جائے اور قومی زبان کو ملکی امور میں جس بنیادی لسانی صلاحیت کی ضرورت ہے، اس کا اہتمام کیا جائے۔ ظاہر ہے اگر صوبائی سطح تک صوبائی زبانیں رائج کی جاتی ہیں، تو قومی زبان میں عمدہ صلاحیت پیدا کرنے کے لیے صوبوں کے نظام تعلیم میں کچھ خاص اہتمام کرنا پڑے گا۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک مرکز

اور صوبوں کے تعلیمی محکموں میں اختیارات کی از سر نو تقسیم نہ ہو اور ملکی ضروریات اور صوبائی ضروریات میں حد فاصل قائم نہ ہو۔ ان حدود کے تعین سے مرکز گریز رجحانات کا خاص طور پر سد باب کرنا ہوگا تاکہ قومی اور صوبائی زبانوں کے درمیان ہم آہنگی ہو سکے۔

یہ مسئلہ بھی سوچنے اور غور کرنے کا ہے کہ ایک ترقی پذیر ملک میں افراد قوم کی زیادہ تر صلاحیتیں محض زبانیں سمجھنے کی نذر نہ ہو جائیں۔ ان سب مسائل کا تقاضا یہ ہے کہ لسانی معاملات کو ملکی مفادات کی روشنی میں طے کر کے زبانوں کی درجہ بندی کا طریق وضع کیا جائے۔ تعلیم کا مسئلہ بہرحال لسانی مسئلے کے قابل قبول حل کے بغیر طے نہیں ہو سکے گا۔

لسانی مسائل میں اردو ادب اور اردو زبان کے منطقے بھی جداگانہ تشخص کے محتاج ہیں۔ اب تک ہم لازمی اردو میں بھی ادب پڑھانے پر اصرار کرتے رہے ہیں۔ ادب کے طالب علم کو ادب پڑھائیے۔ مگر دوسری جانب یہ بھی حقیقت ہے کہ سائنس کے طالب علموں کے حلق سے ادب اتارنے کی کوشش، خوشگوار نتائج پیدا نہیں کر سکتی۔ ادب صرف اس طالب علم کو پڑھائیے جو بنیادی طور پر ادب کا طالب علم ہے۔ لازمی اردو سے طالب علموں کے اپنے مضامین میں استعداد بڑھا کر انھیں اس قابل بنائیے کہ وہ اپنا مافی الضمیر بخوبی بیان کر سکیں اور اپنے مضمون کے مطالب کو دوسروں تک پہنچا سکیں۔ ادب کی اصناف کا مطالعہ، تکنیکی مسائل کا ادراک، ادب کی تاریخ سے واقفیت اور شعرا و ادبا کا تنقیدی جائزہ، لازمی اردو میں غیر ضروری ہے۔ سائنس کے طلبہ کی طرف سے اردو سے عدم دلچسپی کا ایک اہم سبب، یہی تدریس ادب ہے جس سے قومی زبان کو تعلیمی میدان میں اپنا بھرپور کردار ادا کرنے میں دشواری پیش آ رہی ہے۔ اس صورت حال کا سامنا علاقائی زبانوں کو بھی ہے اور ان کا مستقبل بھی دو ٹوک راستہ اختیار کرنے پر منحصر ہے۔

○

دوسرا پیچیدہ مسئلہ اسلامیات کے نصاب کا ہے۔

دینی علوم کی تدریس دو مختلف منطقوں میں ہوتی رہی ہے۔ ایک طرف دینی مدرسوں کا حلقہ ہے جس میں مغربی علوم کا عنصر معدوم ہے۔ اس نصاب کا موجودہ زندگی اور اس کے مسائل سے کوئی تعلق نہیں۔ فرضی اور قیاسی فقہی مسائل اور قدیم عربی زبان و ادب کو اس میں

خاص اہمیت حاصل ہے۔ علامہ شبلی نعمانی کے بیان کے مطابق، قدیم مدارس میں زبان و بیان کے جن سانچوں کو وسیع سمجھا گیا، ان کا تعلق صرف و نحو کے اصولوں اور زبان و بیان کے قدیم اسالیب کے ساتھ ہے۔ عربی زبان کہیں سے کہیں نکل گئی، اس کا محاورہ اور روزمرہ تک بدل گیا، مگر اس زندہ زبان کو ان مدارس میں جگہ حاصل نہیں۔

موجودہ نظام تعلیم میں دینی مدارس ایک الگ نصابی دستور رکھتے ہیں اور ان کی دی ہوئی اسناد کو سرکاری ملازمتوں میں کوئی مقام حاصل نہیں*۔ اس لیے دینی مدرسے، عربی یا فارسی زبان کی تدریس سے الگ، صرف دینی علوم تک محدود ہیں۔ ملک میں دو تعلیمی نظام رائج کرنا مناسب نہیں، ان اداروں کو تدریس کے عام نظام کے ساتھ کسی نہ کسی طرح مربوط کرنا ضروری ہوگا۔

دینی مدارس کے علاوہ مغربی طرز کے اداروں میں اسلامیات کا شعبہ الگ ہے اور مشرقی زبانوں (عربی، فارسی) کی تدریس جداگانہ مضمون کے طور پر ہوتی ہے۔ اس دائرۂ خاص میں زبان کی قدامت و جدیدیت کے میدان بھی بڑی حد تک الگ الگ سے ہوگئے ہیں۔ دینی علوم اور ادبیات کے الگ خانوں میں بٹ جانے سے مسائل کی نوعیت بھی دوہری ہو گئی ہے اور اس سے کئی دوسری شاخیں پھوٹی ہیں:

۱۔ دینی علوم کی تدریس کے جداگانہ مضمون نے اختصاص کا پہلو اختیار کر لیا ہے۔ اس میں وحدت کا تصور ثانوی ہوتا جا رہا ہے۔ قرآن، حدیث اور فقہ کے خصوصی مطالعے کے علاوہ تاریخ اسلام پر خاص زور دیا گیا ہے، لیکن اس سے بعض مضامین میں over laping بڑھ چکی ہے، خصوصاً تاریخ اور فلسفے میں۔ بیک وقت تینوں مضامین اختیار کرنے والے طالب علم کے لیے بعض مطالب میں تکرار و اعادہ ہو گیا ہے۔ یہ ایک انتہا ہے۔

اب دوسری انتہا کو لیجیے: --ایک عام احساس یہ بھی ہو گیا ہے کہ "اسلامیات الگ مضمون ہے تو دینی مطالب کو دوسرے مضامین میں شامل کرنا دوسرے مضامین کو بھی دینیات بنا دے گا"۔ اس لیے ماہرین تعلیم بڑی کوشش سے اردو، عربی، فارسی،

---

*جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں سرکاری ملازمتوں میں یونیورسٹیوں اور دینی مدارس کی ڈگریوں کو برابر کا درجہ دے دیا گیا لیکن ۱۹۹۵ء میں دوبارہ پرانی صورت بحال کر دی گئی۔

انگریزی اور دیگر زبانوں کے نصابات کو دینی عنصر سے خالی کرنے کے در پے ہیں۔ یہ غور و فکر کی ایک دوسری انتہا پسندانہ روش ہے۔ اس سے مضامین کی وحدت کے تصور کو جو نقصان پہنچ رہا ہے، وہ محتاج بیان نہیں۔

اس کے علاوہ اسلامیات کے نصاب میں قرآنی متن کو مرکزی اہمیت حاصل ہونی چاہیے تھی۔ بی اے کے درجے میں دو سورتوں اور ایم اے کے درجے پر دو چار پاروں سے اصل مقصد حاصل نہ ہو گا۔ اسلامیات کے نصاب میں دیگر علوم قرآنیہ کی اہمیت اور ان کا رتبہ، قرآن سے بہرحال کم ہونا چاہیے۔

۲۔ عربی فارسی کی تدریس صرف زبان اور ادب کے حوالے سے ہوتی ہے لیکن یہاں بھی قدیم و جدید زبانوں کے بارے میں ابھی تک کوئی واضح نقطہ نظر نہیں ہے۔ چنانچہ قدیم و جدید کی آمیزش سے جو زبان پڑھائی جاتی ہے، وہ نہ قدیم زبان ہے نہ جدید۔ طالب علم دونوں زبانوں کے درمیان بھٹک رہا ہے۔ مطالب کے اعتبار سے بھی عربی فارسی کی کتابیں دو الگ الگ فکری منطقوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اسلامی اصولوں کی مدون صورت قرآن پاک میں ہے۔ کتابوں کے بعض اسباق میں دینی نقطۂ نظر اسی وسیلے سے آئے گا لیکن دوسرا مقصد بول چال اور ادب سے متعلق ہے۔ دونوں مقاصد کے درمیان ربط کی کوئی صورت نہیں۔

یہ طے کرنا بہت ضروری ہے کہ زبانوں کی تدریس سے ہمارا مقصد کیا ہے؟ صرف زبان سکھانا ہے یا صرف دینی رجحان پیدا کرنا؟ اگر بیک وقت دونوں مقاصد ہیں تو ان میں بنیادی اہمیت کسے حاصل ہے اور ثانوی کسے؟ اب تک دونوں مقاصد کو برابر کی اہمیت دینے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مشرقی زبانوں کی تعلیم جامد، بے مقصد اور تقلیدی ہو کر رہ گئی ہے۔ بلکہ ان کا کوئی رشتہ دنیا کی دوسری جدید زبانوں سے بھی قائم نہیں کیا گیا۔ اگر یہ ہوتا تو اس سے عربی اور فارسی کے مطالعے میں وسعت پیدا ہو سکتی اور ان کا علمی پہلو زیادہ مضبوط ہوتا۔ عربی، فارسی کی تدریس ہمارے تہذیبی، روحانی سرمائے اور بول چال کی زبانوں کے طور پر نہیں رہی۔

ایران و عرب سے ہمارے روابط میں پاکستانی آبادی کا ایک معمولی حصہ بھی شریک نہیں۔ ایسے میں عربی فارسی کو بول چال کی سطح پر پوری طالب علم برادری میں زندہ

کرنا، ناممکن ہی نہیں غلط بھی ہو گا۔ اسلامی ممالک سے روابط اور دیگر کاروباری اور ملکی ضروریات کے لیے درس گاہیں بنا کر بھی یہ مقصد پورا ہو سکتا ہے۔ جب تک ابتدائی درس گاہوں کے استاد جدید زبانوں سے آشنا نہیں ہو جاتے، نیچے کے درجوں میں جدید فارسی اور جدید عربی کی تعلیم نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔ اس کا فیصلہ بھی ضروری ہے، اور یہ احتیاط بھی لازم ہے کہ دینی اور دنیاوی تعلیم، دونوں کا رشتہ گردوپیش کے ماحول کے ساتھ بھی ہو۔

مشرقی زبانوں میں یہ عنصر خاص طور پر توجہ کا طالب ہے۔ ان مضامین سے طالب علم کی عدم دلچسپی کا ایک اہم سبب ماحول کو نظر انداز کرنا بھی ہے اور قریبی ماحول کو نہ قدیم ادب میں پیش نظر رکھا جاتا ہے اور نہ جدید میں۔ تعلیمی سفر کو زمان کی طرف جانے کے لیے مکان کی منزل سے ہو کر چلنا ہو گا۔ کیونکہ تعلیم بہر حال مقام کی مقامیت کو زمان میں تحلیل کرنے کا تاریخی عمل ہے۔ مادے سے روح، حقائق سے تصورات، اور دنیا سے دین کی طرف جانے کے لیے ضروری ہے کہ آس پاس کے حقائق کے تجزیے، مشاہدے اور محاکمے سے چلا جائے۔

۳ پورے نظام تعلیم میں مضامین کی درجہ بندی کیسے ہو؟ یہ اہم اور پیچیدہ سوال ہے۔ اسلام کی گزشتہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے، کہ قرآن کی روشنی میں کائنات کے مطالعے اور تاریخ کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور دین کی اہمیت ان سب پر فائق ہے۔ (جب میں تاریخ لکھتا ہوں تو اس میں پاکستان کی تاریخ کا حصہ بھی شامل ہے۔ جس کا وہ دور زیادہ اہم ہو گا جس کا تعلق مسلمانوں کی آمد کے بعد سے ہے۔)

۴۔ اسلامیات کے موضوع کو نصاب تعلیم میں نمایاں جگہ دینی پڑے گی۔ اس کے بعد سائنس اور تاریخ کو جگہ ملے گی، پھر دوسرے علوم کی باری آئے گی۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے نصاب کی موجودہ تقسیم کو توڑ کر اختیاری اور انتخابی مضامین کی از سر نو درجہ بندی لازم ہو گی۔ ملک کی مادی ضرورتوں کے لحاظ سے بھی مضامین کو مقدم اور موخر کرنا ہو گا، اور جملہ مضامین کو داخلی طور پر باہم مربوط کرنے کے علاوہ، ان کا ایک واضح اور قابل احساس رشتہ، دین کے ساتھ استوار کرنا بھی ضروری ہو گا۔ جبھی پاکستان کے نظام تعلیم میں وہ عناصر ابھر سکیں گے جو اس کے لیے بمنزلہ ریڑھ کی ہڈی کے ہیں۔

ہمارا نظام تعلیم

"قومی تعلیمی کمیشن*" نے ہمارے نظام تعلیم کے موجودہ ڈھانچے کا تجزیہ کرتے ہوئے، کچھ نئی راہیں سجھائی ہیں۔ اس موقع پر ہم چند گزارشات پیش کرتے ہیں:

۱

"مثالی نظام" اضافی اصطلاح ہے۔ ممکن ہے کوئی چیز نظریاتی حیثیت سے تو مثالی ہو، لیکن عملی شکل اختیار کرتے وقت اس کی صورت مختلف ہو جائے۔ ہمارے لیے وہی نظامِ تعلیم مثالی ہو سکتا ہے جس کی جڑیں ہماری ملی روایات، ملکی آب و ہوا اور قومی مزاج میں پیوست ہوں۔ کوئی "در آمد" کردہ نظام نہ تو کامیابی سے چلایا جا سکتا ہے اور نہ اس سے تعلیم کا مقصد ہی پورا ہو سکتا ہے۔ انتظامیہ ہی کی مثال لیجیے، جس ملک کی انتظامیہ کا ڈھانچہ اس ملک کے مخصوص حالات و روایات کے مطابق نہ ہو، وہ یا تو ناکام رہے گی، یا پھر اگر کام کرے گی تو اس سے غلط نتائج پیدا ہوں گے۔

---

*۱۸ اپریل ۱۹۶۳ء۔ "قومی تعلیمی کمیشن"، جنرل محمد ایوب خان کی مارشل لاحکومت نے قائم کیا تھا۔ اس کی رپورٹ پر یہ معروضات تحریر کی گئیں۔

۲

ہمارے لیے وہی نظام اچھا ہو سکتا ہے، جو ہمارے مسائل حل کر سکے۔ ہمارے مسائل کئی قسم کے ہیں: سماجی، اقتصادی اور دینی۔ ہم اپنے موجودہ مسائل کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں: پہلی قسم کے وہ مسائل ہیں، جن کا تعلق پرانے نظام تعلیم سے ہے۔ استعماری نظام تعلیم، میکالے کے ذہن اور رجحان کی پیداوار تھا۔ اس نظام نے ایک ایسی جماعت پیدا کی جو رہتی تو یہاں تھی، لیکن اس کی ذہنی فضا برطانیہ میں تھی۔ میکالے کے نظام تعلیم کا مقصد استعماری حکومت کی مشینری چلانے کے لیے کلرک پیدا کرنا تھا۔ یہ مقصد تو اچھی طرح پورا ہوتا رہا لیکن ہمیں اس نظام سے کچھ خرابیاں ورثے میں ملیں۔

دوسری قسم کے مسائل قیام پاکستان کے بعد پیدا ہوئے۔ پاکستان کی صورت میں ہم نے ایک آئیڈیل حاصل کیا تھا، لیکن جلد ہی ملک کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئی جنھوں نے اصل مقصد گم کر دیا۔ جن اقدار کی خاطر ہم نے جنگ کی اور قربانی دی، وہ نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ معاشرے میں خود غرضی اور ذاتی نفع کے عناصر طاقت ور ہو گئے۔ قانون سے بچنے کا رجحان بڑھا اور حالات نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ کوئی اہم نصب العین سامنے نہ رہا۔ تعلیم اور تعلیمی نظام کا تقدس بھی ان حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ استعماری نظام تعلیم بدیسی ہونے کے باعث پہلے بھی زیادہ اچھی طرح کام نہیں کر رہا تھا، ان حالات سے وہ مزید بگڑ گیا۔

۳

پہلے استاد اور شاگرد کا رشتہ مقدس سا تھا، والدین اور بچوں کا رشتہ بھی قابل قدر اور لائق تحسین تھا۔ اس سے نظم و ضبط کی اقدار کو فروغ حاصل رہا۔ اگرچہ تقسیم سے پہلے ہی ان رشتوں کی حرمت داغ دار ہونی شروع ہو گئی تھی لیکن تقسیم برصغیر کے بعد تو اقدار یکسر بدل گئیں۔ مادیت پسندی نے درمیانی طبقے کو ہوس زر میں مبتلا کر کے اونچا طبقہ بنا دیا۔ تعلیم میں بھی اسی طبقے سے لوگ آئے۔ ان کے سامنے کوئی آئیڈیل نہ تھا، نہ ان کا ماضی سے کوئی قابل

قدر واسطہ تھا، نہ مستقبل کے بارے میں ان کے پاس کوئی نصب العین ہی تھا۔ ایسی فضا میں استاد اور شاگرد کے تعلقات وہ نہ رہے جو ہونے چاہئیں تھے۔ اسی طرح والدین اور اولاد کا رشتہ بھی حالات سے متاثر ہوا۔ اس کے علاوہ ہمارے معاشرے میں اور بھی کئی تبدیلیاں آئیں۔ ان تبدیلیوں سے نئے مسائل پیدا ہوئے۔

۴

پاکستانی معاشرے کی بنیاد اسلام پر ہے۔ ہم اس بنیاد کو نہیں چھوڑ سکتے۔ قومی تعلیمی کمیشن (۱۹۶۱ء) نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ کمیشن کی رپورٹ کا یہ حصہ بڑا اہم ہے۔ لیکن کمیشن نے نظام تعلیم میں جن تبدیلیوں کی سفارش کی ہے، ان پر عمل کرنے کا مرحلہ ابھی باقی ہے۔ کسی چیز کو عملی شکل دیتے وقت بہت سی تفصیلات میں جانا پڑتا ہے۔ بعض اوقات تفصیلات میں کھو جانے سے اصل روح بھی فوت ہو سکتی ہے۔ ہمیں نئے نظام تعلیم کو رائج کرتے وقت احتیاط سے کام لینا پڑے گا۔ "کمیشن" نے امتحان کے میکانکی طریق کی بھی مخالفت کرتے ہوئے بعض دور رس تبدیلیوں کی سفارش کی ہے۔ اس کے علاوہ تعلیم و تدریس کے عملی پہلوؤں پر زور دیا ہے۔

۵

ہمارے ہاں نئے نظام تعلیم کو عملی شکل دینے کے لیے ابھی کوئی واضح تصور نہیں پایا جاتا۔ ماہرین تعلیم عموماً نئی اور پرانی خرابیوں کو ملا جاتے ہیں۔ بعض اوقات بنیادی خرابیوں ہی کو خوبیاں سمجھتے ہیں۔ پھر کچھ لوگ ماضی قریب سے رشتہ توڑنا چاہتے ہیں اور کچھ رابطہ قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اس انتشار میں کوئی واضح راستہ اختیار کرنا مشکل ہے۔ تاہم کمیشن کی بعض سفارشات ہمارے لیے اہمیت رکھتی ہیں۔ نئے نظام میں استاد کا متعینہ وقت میں کالج میں حاضر رہنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ بلاشبہ استاد کو کالج میں حاضر رہنا چاہیے، لیکن اس مسئلے کو ریاضی کے فارمولے سے حل کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے، انسان اور مشین میں فرق ہے۔

۶

کمیشن کی رپورٹ میں ایک کوتاہی یہ ہے کہ مشرقی زبانوں سے متعلق پوری تفصیلات موجود نہیں، جس سے عمومی سفارشات کی غلط تعبیر کی گنجائش پیدا ہو گئی ہے۔ مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے لوگ اپنے اپنے خیال کے مطابق تعبیر کر سکتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس مسئلے کو اس کے اصل تناظر میں رکھ کر دیکھا جائے۔ مشرقی زبانوں کے بارے میں ایک مسئلہ جدید اور کلاسیکل کا بھی ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ مضامین کس طرح پڑھائے جائیں۔ تیسرا یہ کہ مشرقی زبانوں کی تعلیم کا مقصد کیا ہے؟ کاروبار یا علم، اس ضمن میں کمیشن نے پوری تفصیل پیش نہیں کی۔ ان مسائل کا حل ڈھونڈنا شارحین کا کام ہے۔ ریاست کا بنیادی رجحان ہے اور شخصی اور اجتماعی تصورات کے جملہ پیمانے اسی مرکزی نقطے سے متعلق ہیں۔ پاکستان میں نظریہ پاکستان کے خلاف کسی بھی آواز کو، جو اس ملی شخص سے متصادم ہو اور اس کے وجود پر اثر انداز ہو سکتی ہو، کسی طرح بھی برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

اگر پاکستان نظریاتی مملکت نہیں ہے تو اس ساری جدوجہد آزادی کا مطلب کیا ہے جو حصول پاکستان کے لیے کی گئی اور جس کے لیے وسیع پیمانے پر قربانیاں دی گئیں؟ اگر کوئی نظامِ فکر اس اساسی رویے ہی سے براہ راست متصادم ہے تو اس کا وجود قوم وملت کی بقا کے منافی ہو گا۔ پاکستان کے حوالے سے اگر کوئی شخص اس کا اعلان کرے کہ پاکستان کو بھارت میں ضم ہو جانا چاہیے یا اپنے سیاسی دیوالیہ پن کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہے کہ "پاکستان انگریز نے تخلیق کیا" تو ان خیالات کی زد پاکستان کی سالمیت پر پڑے گی۔ ایسے میں معاشرہ آزادی رائے کی اس صورت کو کبھی قبول نہیں کرے گا۔ برطانیہ میں بھی آزادی رائے کی ایک حد ہے، جس کی اجازت صرف ہائیڈ پارک میں ہے اور اس سے باہر اس کا تصادم قانون سے ہو جاتا ہے۔

ایک معلم کی حیثیت سے میری رائے یہ ہے کہ افراد کی ذہنی توانائی کے لیے تمام ادارے ہائیڈ پارک نہیں بنائے جا سکتے۔ فرد کی ذہنی توانائی کے لیے ہائیڈ پارک کا حدود اربعہ متعین کرنا پڑے گا۔ بحث کی آخری شکل کہ مذہبی مسائل سے متصادم خیالات پر پابندی لگائی جائے یا نہ لگائی جائے، اگر یہ بات درس گاہوں کے حوالے سے ہے تو درس گاہوں کے

شرائط اور ضابطے اور حکومت کے ضابطوں کا احترام بہر حال ضروری ہے۔ باقی رہا ہائیڈ پارک کا مسئلہ، تو اس کے لیے دریائے راوی کے کنارے اگر کوئی علاقہ مخصوص ہو جائے تو مناسب ہو گا۔ پاکستان کی معاشرتی زندگی اس آزادی کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

تعلیم میں آزادی رائے کا مسئلہ

تعلیم میں آزادی کا مفہوم کیا ہے؟
نظریاتی مملکت میں تعلیم میں آزادی کا مطلب کیا ہے؟ اور مذہبی مسائل سے متصادم خیالات پر پابندی یا عدم پابندی کی حیثیت کیا ہے؟

یہ تین سوال ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ تعلیم میں آزادی یعنی انفرادی و شخصی آزادی کی حدود کا تعین دو باتوں سے ہوتا ہے: کسی معاشرے کی اپنی بنیادی اقدار کے حوالے سے، اور فرد اور معاشرے کے درمیان توازن یا عدم توازن کے حوالے سے--- مثلاً جس طرح کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا اور زندگی کے دوسرے انفرادی مظاہر ہر فرد کے پیدائشی حقوق میں شامل ہیں، کیا اسی طرح آزادی رائے بھی فرد کا ذاتی فعل ہے۔ کیا اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ معاشرے کے بنے ہوئے سانچے اور اقدار کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر لے اور اس بغاوت کے لیے تبلیغ و اشاعت کی پوری آزادی کا طالب بھی ہو؟

اس مرحلے پر آ کر یہ مسئلہ محض فرد کی شخصی پسند و ناپسند کا مسئلہ نہیں رہتا۔ آپ کو حق حاصل ہے کہ آپ اپنے ہاتھ میں چھڑی لے کر اسے ہوا میں لہراتے اور گھماتے رہیں، آپ کا یہ انفرادی فعل کسی دوسرے شخص کے فعل سے متصادم نہیں تو آپ کو اپنے اس فعل کی پوری آزادی ہے، لیکن جب آپ یہی فریضہ سڑک پر انجام دیتے ہیں اور آپ کی چھڑی کی زد دوسروں کے چہروں اور شانوں پر پڑتی ہے، تو وہاں سے معاشرے کی حدود

شروع ہو جاتی ہیں۔ آزادی رائے کے اظہار، اس رائے کی نشر و اشاعت اور اس کے نتیجے میں اس کا آزادانہ اور عملی طور پر صورت پذیر ہونا، اگر یہ تینوں حالتیں بعض ایسے نتائج کی حامل ہیں، جن کا تعلق براہ راست معاشرے اور معاشرے کے متعین کردہ اصول و قواعد سے ہے، تو پھر ایسی آزادی کی اجازت کوئی آزاد خیال بھی نہیں دے سکتا۔

برطانیہ میں جمہوری آزادی ہے۔ رائے دہی اور رائے کے اظہار کا حق حاصل ہے، لیکن وہاں بھی اگر اس اظہار رائے کی زد قومی مفاد اور ملکی آزادی پر پڑتی ہو تو اسے برداشت نہیں کیا جاتا۔ ان حالات سے یہ نتیجہ نکالنا غیر متعلق نہ ہوگا کہ کوئی بھی منظم ملک یا معاشرہ، اپنے متعین کردہ راستے سے ہٹ کر کسی دوسری فکری تحریک یا کسی انفرادی آزادی رائے کی اجازت نہیں دیتا، جہاں اس کی زد خود معاشرے کی بقا اور اس کے وجود پر براہ راست پڑتی ہو وہاں آزاد خیالی کی کوئی حیثیت نہیں۔

اس مسئلے کو نفسیاتی لحاظ سے دیکھا جائے تو شخصی آزادی اور اپنے ضمیر کی آواز کا جواز معاشرے کے فروعی پہلوؤں میں قابل تسلیم رہتا ہے۔ نفسیات میں بھی نارمل اور ابنارمل کا امتیاز مسلمہ طریق زندگی کے قُرب یا بُعد کے پیمانے ہی سے جانچا جاتا ہے۔ اس کا حل تو یہی ہو سکتا ہے کہ فرد کی آزادی رائے کو معاشرے کی آزادی رائے سے متصادم نہ ہونے دیا جائے۔ انا الحق کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا ہے

اگر فردے بگوید سرزنش بہ
اگر قومے بگوید ناروانیست

فرد اور معاشرے کی ذمہ داریاں ایک ایسی مملکت میں بڑھ جاتی ہیں، جہاں افراد کی اکثریت نے ایک مخصوص نظریے کی مدد سے سلطنت قائم کی ہو۔ نظریہ پاکستان اس ریاست کا بنیادی رجحان ہے اور شخصی اور اجتماعی تصورات کے جملہ پیمانے اسی مرکزی نقطے سے متعلق ہیں۔ پاکستان میں نظریہ پاکستان کے خلاف کسی بھی آواز کو، جو اس ملی تشخص سے متصادم ہو اور اس کے وجود پر اثر انداز ہو سکتی ہو، کسی طرح بھی برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

اگر پاکستان نظریاتی مملکت نہیں ہے تو اس ساری جدوجہد آزادی کا مطلب کیا ہے جو حصول پاکستان کے لیے کی گئی اور جس کے لیے وسیع پیمانے پر قربانیاں دی گئیں؟ اگر کوئی نظامِ فکر اس اساسی رویے ہی سے براہ راست متصادم ہے تو اس کا وجود قوم و ملت کی بقا کے

منافی ہو گا۔ پاکستان کے حوالے سے اگر کوئی شخص اس کا اعلان کرے کہ پاکستان کو بھارت میں ضم ہو جانا چاہیے یا اپنے سیاسی دیوالیہ پن کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہے کہ "پاکستان انگریز نے تخلیق کیا" تو ان خیالات کی زد پاکستان کی سالمیت پر پڑے گی۔ ایسے میں معاشرہ آزادی رائے کی اس صورت کو کبھی قبول نہیں کرے گا۔ برطانیہ میں بھی آزادی رائے کی ایک حد ہے، جس کی اجازت صرف ہائیڈ پارک میں ہے اور اس سے باہر اس کا تصادم قانون سے ہو جاتا ہے۔

ایک معلم کی حیثیت سے میری رائے یہ ہے کہ افراد کی ذہنی توانائی کے لیے تمام ادارے ہائیڈ پارک نہیں بنائے جا سکتے۔ فرد کی ذہنی توانائی کے لیے ہائیڈ پارک کا حدود اربعہ متعین کرنا پڑے گا۔ بحث کی آخری شکل کہ مذہبی مسائل سے متصادم خیالات پر پابندی لگائی جائے یا نہ لگائی جائے، اگر یہ بات درس گاہوں کے حوالے سے ہے تو درس گاہوں کے شرائط اور ضابطے اور حکومت کے ضابطوں کا احترام بہرحال ضروری ہے۔ باقی رہا ہائیڈ پارک کا مسئلہ، تو اس کے لیے دریائے راوی کے کنارے اگر کوئی علاقہ مخصوص ہو جائے تو مناسب ہو گا۔ پاکستان کی معاشرتی زندگی اس آزادی کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

فصل دوم

تعلیم اور اقبالیات

اقبال کا تصور تعلیم اور عصری صورت حال ـ ۱

پنجاب یونیورسٹی میری مادر علمی ہے۔ میرے لیے یہ ایک اعزاز ہے کہ علامہ محمد اقبال کے تصور تعلیم پر خطبے کے لیے اس بار قرعہ فال میرے نام پڑا۔

○

میرے لیکچر کے دو حصے ہوں گے۔ آج میں "علامہ اقبال کے تصور تعلیم" کے بارے میں چند باتیں عرض کروں گا۔ کل کے لیکچر کا موضوع، ان بنیادی تصورات کا "پاکستان کی عصری صورت حال پر اطلاق" ہو گا۔

مواد کم ہے۔ دو چار گنی چنی کتابیں ملتی ہیں، جن میں اقبال کے تصور تعلیم کے فلسفیانہ مدار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایک آدھ میں ان فلسفیانہ مسائل کو وسیع تر تناظر میں رکھ کر اقبال کے فلسفہ خودی کے اطراف و جوانب میں واقع منطقوں پر مفصل گفتگو کی گئی ہے، جس سے تصور تعلیم کے بارے میں کم اور اقبال کے فلسفے کے بارے میں زیادہ معلومات دستیاب ہیں۔

پہلے حصے میں بنیادی فلسفیانہ مسائل اور تعلیمی تصورات کے باہمی رشتوں پر گفتگو ہو گی۔ گویا انہی جہات میں بات چیت ہو گی جن پر اقبال کے نظریہ تعلیم کے حوالے سے مجھ

۱۹۹۳ء۔ شعبہ فلسفہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور کے زیر اہتمام "اقبال لیکچر"۔

سے پہلے بعض اصحاب اظہار خیال فرما چکے ہیں، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ میں نے ان تعلیمی افکار کو ایک فکری سانچے سے منسلک کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوسرے حصے میں البتہ اقبال کے تعلیمی تصورات کی اطلاقی صورتوں کا جائزہ لیا جائے گا، تا کہ جدید نظام تعلیم اور قدیم تعلیمی تصورات کے پس پردہ کار فرما رشتوں کا سراغ لگایا جا سکے، اور یہ معلوم ہو سکے کہ اقبال کی نظر میں ان کے مابین تطبیق و تعبیر کی کیا ممکنہ صورتیں ہیں اور عصر حاضر پر اس کا اطلاق کہاں تک ممکن ہے؟

اقبال مغربی علوم کے حق میں تھے لیکن قدیم سرمائے کو بھی نظر انداز کرنے کے قائل نہیں تھے۔ فلسفیانہ سطح پر وہ جملہ عوامل کو اکائی کی صورت میں دیکھتے تھے اور ماضی، حال اور مستقبل کو ایک کل کے طور پر متشکل کرنا چاہتے تھے۔ وہ جدید علوم کی افادیت کے منکر نہ تھے لیکن جدید اور قدیم کے درمیان تطابق کو ضروری جانتے تھے، اس لیے ان کے ہاں مغربی تعلیم کی بعض خرابیوں کا برملا اظہار بھی ملتا ہے اور قدیم سرمایۂ علم کی توسیع کا احساس بھی۔ ان دونوں کے درمیان ایک نئے امتزاج (synthesis) کی تلاش ان کے نزدیک ضروری تھی۔ ہم اگر فکرِ اقبال کے پہلوؤں کو صحیح تناظر میں رکھ کر نہیں دیکھیں گے تو بعض جگہ ہمیں تضاد کا شبہ ضرور ہو گا۔

یہ احساس شاید اس لیے بھی ہوتا ہے کہ اکثر و بیشتر اقبال کے شعری سرمائے ہی سے ان کے اساسی تصورات کا استخراج کیا جاتا رہا اور ان کے نثری کارناموں کو زیادہ لائق اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ علامہ کی نثری تحریروں کو شعری مواد سے ملا کر دیکھنے کی سعی کم کم کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تصوراتِ اقبال، کثرت تعبیر سے ایک ملغوبہ سا بن گئے۔ خالق تصور پاکستان ہونے کے ناتے سے اقبال کے اکثر تصورات کو سیاسی طور پر استعمال بھی کیا گیا۔ مختلف مکتبۂ فکر کے رہنماؤں نے اپنے اپنے مطلب کی چیزیں، سیاق و سباق سے جدا کر کے، اپنے حق میں استعمال کیں اور اصل اقبال ہماری نظروں سے اوجھل ہوتا چلا گیا۔

زیرِ نظر مطالعے میں کوشش کی گئی ہے کہ علامہ کے نثری سرمائے اور شعری تخلیقات کے درمیان امکانی رشتوں کو پیش نظر رکھ کر، علامہ کے تصور تعلیم کا جائزہ لیا جائے۔

۱

علامہ اقبال کے فلسفۂ تعلیم پر پہلی کتاب Iqbal's Educational Philosophy ہے، جسے خواجہ غلام السیدین نے لکھا۔ یہ کتاب علامہ کی زندگی میں لکھی جا رہی تھی اور اس کا خاکہ علامہ کو دکھایا بھی گیا، لیکن یہ ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی اور انتقال کے بعد ۱۹۳۸ء ہی میں منظر عام پر آئی۔ یہ ان کے تعلیمی نظریات پر پہلی اور مقبول ترین کتاب ہے۔ ۱۹۹۰ء تک اس کے پانچ ایڈیشن شائع ہوئے۔ تقسیم برصغیر کے بعد مصنف نے اس پر نظرثانی کر کے کئی اقتباسات کا اضافہ بھی کیا تھا۔ اس میں علامہ اقبال کے فلسفے کے ان گوشوں کو پیش کیا گیا، جن کا تعلق کسی نہ کسی نہج سے علامہ کے تصور تعلیم سے ہو سکتا ہے۔ کتاب تکمیلی صورت میں نو ابواب پر مشتمل ہے، پہلے دو باب انفرادیت کے بارے میں ہیں، تیسرے میں روحانی اور مادی تصورات کے رشتوں کی بات کی ہے، چوتھا باب فرد اور معاشرے کے باہمی ربط پر ہے، پانچویں میں تخلیقی ارتقا چھٹے میں عقل اور کشف کا ذکر ہے، ساتویں میں اچھے کردار اور تعلیم کے تعلق کو بیان کیا گیا ہے، آٹھواں باب اسلام کے سماجی نظام پر ہے اور نویں میں تعلیم کا تخلیقی تصور پیش کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب علامہ کے چند فلسفیانہ افکار کے بنیادی پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ ہے:

۱۔ فرد کی تعلیم و تربیت

۲۔ مادی اور روحانی زندگی کے درمیان تعلق

۳۔ انسان کی تخلیقی قوتوں کا جو کشفی رشتہ (اقبال کی زبان میں عشق) عقلی مسائل کے ساتھ ہے۔ نیز

۴۔ اچھے کردار کی تشکیل اور اس کے اسلامی نظام میں فعال کردار کو موضوع بنایا گیا ہے۔

گویا علامہ کے فلسفیانہ نظام کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی اور فرد کی تعلیم و تربیت اور خودی کے حوالے سے اس کی نشوونما، نیز رموز بے خودی کے حوالے سے فرد کا جو رشتہ معاشرے کے ساتھ ہے، اس کی بعض کڑیاں بیان ہوئی ہیں۔ بنیادی زور علامہ کے فلسفیانہ افکار پر ہے اور تعلیمی پہلو دب سا گیا ہے۔ صرف نواں باب اصل موضوع سے متعلق کہا جا سکتا ہے اور اس کو پوری کتاب کا حاصل سمجھنا چاہیے۔

دوسری اہم کتاب اقبال کے تعلیمی نظریات ہے۔ یہ اول الذکر کتاب کی توسیعی شکل ہے، جس میں کچھ ڈایا گراموں کا اضافہ کر کے، فرد کی تعلیم اور اس کے ماحول کے رشتوں کو واضح کیا گیا ہے۔ نظام تعلیم کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کے لیے ڈایا گرام استعمال ہوئے ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان اشکال کا تعلق علامہ اقبال کے تصور تعلیم کے ساتھ پوری طرح قائم نہیں ہو پایا۔ بہرحال اپنی حدود میں یہ کتاب غلام السیدین کے فلسفیانہ بیانات کو سہل زبان میں پیش کرتی ہے۔

۱۹۶۶ء-۶۷ کا سال اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں اقبال کے تعلیمی تصورات کی طرف زیادہ توجہ رہی۔ جامعہ ملیہ کالج ملیر، کراچی میں ۲۲ - ۲۴ اپریل ۱۹۶۶ء کو "اقبال اور تعلیم" کے عنوان سے ایک سیمینار ہوا، جس میں اقبال کے تعلیمی تصورات کے مختلف پہلوؤں پر مقالات پیش ہوئے۔ اقبال کے فلسفے کی تعلیمی نوعیت، اقبال کا تصور انسان و معاشرہ، فکر اقبال میں مشرق اور مغرب کا تعلق، اقبال کی نظر میں تعلیم کے مقاصد، اقبال کا فلسفہ اور تعلیمی نفسیات، اقبال بطور استاد، اقبال کا اثر پاکستانی تعلیمی منظر نامے پر اور پاکستان کی ذہنی زندگی پر اقبال کا اثر، کے موضوعات پر مقالے پیش ہوئے اور *Iqbal and Education* کے عنوان سے شائع ہوئے۔ ان مقالات میں تعلیمی تصورات کے بارے میں کم اور اقبال کے فلسفہ حیات پر زیادہ زور ہے۔ سبب شاید یہ ہے کہ اقبال کے تصور انسان اور تعلیمی تصورات کے درمیان حد بندی مشکل ہے۔

ایک اہم کتاب جو "بزم اقبال" کی طرف سے ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی، بیروت کی امریکی یونیورسٹی کی پیش کردہ ایم-اے تعلیمات کا تحقیقی مقالہ ہے، جس کا عنوان Iqbal: Philosophy and Education ہے۔ اس کے مصنف میاں محمد طفیل ہیں، جنھوں نے اقبال کی زندگی، تصانیف اور فلسفے کے بارے میں تین باب لکھے ہیں۔ صرف چوتھا باب ہمارے موضوع سے متعلق ہے۔ یہ بات اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں پہلی بار نصابات کو موضوع بنایا گیا ہے اور اقبال کے نصابی نقطہ نظر کی وضاحت کی گئی ہے۔ اقبال کی نظر میں نصاب سازی میں مواد پر قدرت کی ضرورت نہیں بلکہ نصاب کا کام گردوپیش کے بارے میں انسانی شعور کی بیداری اور نصب العین کی بازیافت ہے۔

(محمد طفیل "اقبال، فلاسفی اینڈ ایجوکیشن"، ص ۱۱۰، ۱۹۶۶ء)

اس کے علاوہ امریکی ماہر تعلیم ڈیوی (Dewey) اور اقبال کے تصورات تعلیم کے درمیان مشابہت اور اختلافات کی بطور خاص نشاندہی کی گئی ہے۔ اس نقطۂ نظر کی بنیادی اہمیت اس چیز سے ہے کہ وقت کی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ مقاصد کے حصول کے لیے درسی مواد کی وقتاً فوقتاً تبدیلی ناگزیر ہے۔

اقبال اور مسئلہ تعلیم کے موضوع پر ۱۹۷۸ء میں محمد احمد خاں نے کتاب لکھی، جو ۱۳ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں علوم جدید کے بارے میں اقبال کے تصورات، مقاصد تعلیم کے بارے میں سیکولر اور دینی تعلیم کا فرق، اقبال کے تصور امتزاج، علم و عشق اور اسلامی ریسرچ کے علاوہ تعلیم نسواں اور صنعتی تعلیم کے بارے میں علامہ کے اقتباسات کسی قدر تفصیل کے ساتھ درج کیے ہیں۔ اس لحاظ سے اسے خواجہ غلام السیدین کی کتاب کا ایک اگلا قدم تصور کرنا چاہیے۔ مشاہدۂ قدرت، استقرائی طرز استدلال اور تجربی طریقۂ تحقیق، پہلی بار تفصیلی طور پر موضوع بحث بنے ہیں۔ اس لحاظ سے اس کتاب کا دوسرا باب بہت اہم ہے۔

۱۹۷۸ء ہی میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی اقبال سب کے لیے آئی جس میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ ایک باب علامہ کے تصور تعلیم کے سلسلے میں شامل ہے۔ یہ مواد کتاب کے باب چہارم میں درج ہے۔ اس میں انھوں نے اقبال کے تعلیمی نظریات کے بارے میں لکھے گئے مواد کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ان کی رائے کے مطابق فلسفہ تعلیم کے متعلق شائع ہونے والی مذکورہ بالا کتابوں میں تعلیم کے اصطلاحی مفہوم کی بجائے عام مفہوم کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ غیر اصطلاحی مفہوم میں تعلیم سے مراد آدرش، پیغام، درس حیات یا ہدایات وغیرہ قرار دیے گئے ہیں۔ جملہ کتب میں اسی پہلو کو ماہرین تعلیم نے سامنے رکھا ہے۔ اصطلاحی مفہوم میں درس و تدریس، تعلیم و تعلم یا مدرسہ و مدارس سے متعلق مسائل کو سرے سے معرض بحث میں لایا ہی نہیں گیا۔ ڈاکٹر فرمان صاحب نے لازمی تعلیم کے موضوع پر علامہ اقبال کی تقریر (۱۸ فروری ۱۹۱۲ء) کا حوالہ دیا ہے۔ پھر ۱۹۳۲ء میں اسلامی تاریخ کے پرچے کے خارج از نصاب کیے جانے کا ذکر کر کے علامہ اقبال کے تصورات کو تھوڑی سی تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اسلامی مرکز کے قیام اور مشرقی علوم اور مغربی علوم کے درمیان رشتوں کے بارے میں چند اشارے بھی درج ہیں۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے ضرب کلیم میں

تعلیم و تربیت کے مسائل والے اشعار درج کر کے علامہ کے تصور تعلیم سے ان کا ربط قائم کیے بغیر درمیانی کڑیوں کی تلاش کا کام قارئین پر چھوڑ دیا ہے۔

کراچی ہی سے ایک اور کتاب مسٹر جو بش کی ہے۔ یہ ایم اے کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے لکھا گیا ایک تحقیقی مقالہ ہے۔ دراصل یہ مقالہ "اقبال کے تعلیمی نظریات" کی تلخیص ہے۔

تعلیم کے حوالے سے اقبال پر سب سے اہم کتاب افتخار حسین صدیقی کی ہے۔ اقبال بحیثیت مفکر تعلیم ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی اور اب تک اقبال کے نظریہ تعلیم پر لکھی جانے والی کتابوں میں سب سے اہم اور قابل توجہ ہے۔ اس میں فکر اقبال کے بعض گوشوں کو نمایاں کر کے، ایسے پہلوؤں کو ابھار کر کیا گیا ہے جن کا تعلق واقعی علامہ کے تصور تعلیم کے ساتھ ہے۔ صرف ایک پہلو سے یہ کتاب تشنہ ہے کہ مصنف نے فکر اقبال پر مغربی فلسفیوں اور ماہرین تعلیم کے اثرات کا پورا احاطہ نہیں کیا، اور مفکرین و ماہرین تعلیم کے نظریات کو الگ الگ پیش کر دیا ہے اور ان کا رشتہ فکر اقبال سے اس طرح نہیں ملایا کہ فکر اقبال پر ان مفکرین کے تصورات کا اثر معلوم ہو سکے۔ باقی امور میں یہ کتاب یقیناً بڑی اہمیت کی حامل ہے اور ساتویں باب کو چھوڑ کر، جس میں اقبال نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں، اس موضوع پر یہ پہلی سنجیدہ کوشش ہے۔

۲

ان کتب کی روشنی میں اقبال کے تصور تعلیم پر غور کیا جائے تو اس میں علامہ کی ذہنی اساس چار فکری تصورات پر مبنی نظر آتی ہے۔

- تصور توحید
- تصور زمان و مکاں
- عمل اور حرکت کا تصور
- اعتدال کا قانون

علامہ کی فکر کے یہ چار پہلو ان کے دینی تصور سے نکل کر فلسفیانہ افکار تک پھیلے ہوئے

نظر آتے ہیں اور زندگی کے مختلف مظاہر کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہیں۔

تصور توحید

تصور توحید محض خدا کو ایک ماننے پر منحصر نہیں، بلکہ علامہ اس کی تجرید کرتے ہوئے اسے زندگی کے مختلف پہلوؤں میں پھیلاتے ہیں۔ انسانی ذہن کے حوالے سے یہ ایک وژن (vision) ہے اور وحدت فکر پر منتج ہوتا ہے۔ سماجی حوالے سے ملت کی وحدت تمدنی وحدت، دین اور دنیا کی وحدت، موت اور حیات کی وحدت، انسان اور خدا کے رشتے کی وحدت، شخصی آزادی اور معاشرے کی حدود کا باہمی تعلق، معاشرے اور فرد کی اکائی، جسم اور روح کی وحدت، روحانیت اور مادیت کی وحدت، عقل و عشق کی اکائی، علم اور عمل کی وحدت اور زندگی کے دوسرے دوائر میں یک جہتی کی جستجو کا نام ہے۔ تعلیمی میدان میں یہ شخصیت کی وحدت، وحدت فکر کی جملہ اشکال یا اقبال کی زبان میں خودی کی نشوونما پر منحصر ہے۔ یہ سارا عمل تضاد کا مقابلہ کر کے وحدت کی تلاش کا عمل ہے۔ حیوانی خودی اور رحمانی خودی میں رحمانی خودی کی تشکیل اور شیطانی خودی کو مسخر کرنے کی خواہش اہم ہے۔ تضادات میں وحدت کی تلاش و جستجو، سماجی سطح پر وحدت انسانی کی طرف جانے کا عمل ہی تو ہے۔ روزمرہ زندگی میں گویا یہ عمل جستجوئے اخوت پر مشتمل ہے۔

تعلیم میں معراج اخوت یہ ہے کہ تعلیم سے دوئی کو خارج کیا جائے۔ نصاب میں وحدت کی بحالی، نصاب کو اکائی میں تبدیل کرنے کا عمل بھی ہے اور فرد کی نشوونما میں فرد کی خودی اور اجتماعی خودی کے درمیان وحدت کی تلاش بھی۔ یہ وحدت آزادی کی حدود کے تعین پر منحصر ہے۔ حریت فکر و عمل کی طرف پیش قدمی، آزادی اور مادر پدر آزادی کے درمیان فرق، اور تقلید اور آزادی میں توازن قائم کرنے کی جستجو کے بغیر نظام تعلیم گمراہی کا سبب ہے۔ اس اعتبار سے اسلام کا نظام اخلاق ایک زندہ حقیقت بن کر سامنے آتا ہے۔

شخصی آزادی، معاشرے کا عمل دخل، انسان اور خدا کا رشتہ، رسالت کا تصور، بندے کا خدا سے رشتہ، بندے کا بندے سے رشتہ اور معاشرتی ارتکاز، وہ پیمانہ ہے جس میں فرد کی روحانی نشوونما کے ساتھ ساتھ اس کی اخلاقی تربیت بھی، معاشرے ہی کے فرائض میں شامل ہے۔ یہ طریق کار دین کے ساتھ دنیا کی بحالی اور زندگی میں اعلیٰ مقاصد کے لیے لگن پیدا کرنے

کا عمل ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک سماجی عمل بھی ہے۔

علامہ اقبال انسان اور کائنات کے باہمی رشتوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ وہ دین کے ساتھ دنیا کے بھی قائل ہیں۔ اسلام کو وہ مذہب نہیں سمجھتے بلکہ زندگی بھر کا ایک لائحہ عمل جانتے ہیں اور مذہب کی خاطر دنیا کی نفی کرنے کے قائل نہیں۔ گویا وہ اسلام کو مذہب نہیں، دین مانتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر سید عبد اللہ، "وہ خدا، کائنات اور انسان تینوں کو ایک ہی حقیقت مطلقہ تسلیم کرتے ہیں، وہ اسے تین رخوں کی حیثیت سے دیکھتے اور مجموعی نظام کائنات میں تینوں کو ایک مرتبہ دیتے ہیں۔ اس لیے ان کے تصور تعلیم میں تینوں کو یکساں اہمیت حاصل ہے"۔

زمان ومکاں

علامہ کے ہاں زماں ومکاں کا تصور بھی تصور توحید کی طرح علامتی حیثیت رکھتا ہے۔ خطبات میں وہ زمان ومکاں کے تصور کو مسلمانوں کے لیے موت وحیات کا مسئلہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کی فکری زندگی میں زمان ومکاں کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، اس لیے وہ اسے ایک سے زیادہ اطراف میں پھیلا کر دیکھتے ہیں۔ زمان ومکاں ان کے نزدیک مادے سے توانائی تک کا سفر ہے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ بھی توانائی کی آخری صورت بن کر خطبات میں جلوہ گر ہیں۔ یہی مکاں سے زماں تک کا سفر بھی ہے۔

اقبال حب وطن کو ایک نفسیاتی حقیقت تصور کرتے ہیں، لیکن سفر زندگی میں وہ اس تعمیم کو ضروری قرار دیتے ہوئے، وطن کی محبت کو بالآخر ملت کی محبت اور جغرافیے کو اقدار میں بدل دینے کا عمل گردانتے ہیں۔ زمان ومکاں کی تیسری جہت، حقائق سے تجرید کی طرف جانے کا عمل بھی ہے۔ خدا، کائنات اور انسان، تینوں کو وہ ایک ارتقائی ذہنی عمل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ماضی، حال اور مستقبل ایک رشتے میں پروئے ہوئے ہیں اور شخصی یا سماجی عمل کا حصہ ہیں۔ یہ کائنات مسلسل ترقی اور عمل کی طرف گامزن ہے۔ ہر لمحہ انسانی زندگی بدلتی رہتی ہے۔ نئے نئے روپ اختیار کرتی ہے اور جادہ ترقی پر گامزن ہے۔ اسی طرح علوم وفنون بھی مسلسل ارتقا کی طرف رواں ہیں۔

اسی بنا پر ہر دور میں اسلام کے بنیادی افکار کی تشکیل نو ضروری رہی ہے۔ فقہی سطح پر

یہ فقہ اسلامی کی تعبیر نو ہے۔ قرون وسطیٰ کا نظام فقہ آج مؤثر نہیں رہا۔ عصر حاضر میں اجتہادی نقطۂ نظر کے ذریعے اس کی تشکیل جدید ضروری ہو گئی ہے۔ تعلیمی لحاظ سے بھی معاشرے کو ایک ایسے فرد کی ضرورت ہے جو مکاں سے بلند ہو کر زمانی تسلسل کو آشکار کر سکے۔

تعلیم کا نصب العین ایک ایسے مرد حُر، مرد مومن اور انسان کامل کی تلاش ہے جو معاشرے میں حقائق حیات کی روشنی میں اسلام کی تعبیر نو کا اہل ہو۔ تعلیم کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ معاشرہ ایسے فرد کو جنم دے۔ لازم ہے کہ سماج، تعلیم و تربیت کا ایک ایسا نظام وضع کرے جس میں فرد، وحدت فکر سے ہم کنار ہو کر معاشرتی ضرورت کو پورا کر سکے اور ماضی کو رد کیے بغیر، حال کا رشتہ آئندہ کے امکانات کے ساتھ جوڑ سکے۔

عمل اور حرکت کا تصور

علامہ اقبال کے نزدیک وحدت فکر اور اجتہاد کا عمل بڑھتے ہوئے تمدن اور تسلسل حیات کے لیے حرکت اور عمل کے بغیر ممکن نہیں۔ زندگی میں شیطانی اور رحمانی عناصر ایک دوسرے سے دست و گریباں رہتے ہیں، ترمیم اور تنسیخ کا عمل مسلسل جاری ہے، خیر اور شر کی قوتیں ایک دوسرے سے آمادۂ پیکار ہیں۔ انسان ایک اختیار یافتہ وحدت ہے۔ وہ اپنی ارتقائی صورت میں مادے کو روحانی اقدار کے لیے استعمال کرتا ہے۔ انسان شیطانی قوتوں سے مسلسل برسرِ پیکار رہتا ہے اور بقول اقبال، اجتہادی گہرائیوں میں اتر کر فکر ذہنی کی تشکیل نو کرتا ہے۔ انسان مسلسل جدوجہد میں مبتلا ہے۔ یہی زندگی کا لازمی عنصر ہے۔

اسلام میں حرکت کا اصول، زندگی کی تگ و دو کا نقطۂ ارتکاز ہے۔ گویا عمل اور حرکت زندگی کا دوسرا نام ہے۔ عمل اور خواہشات سے کنارہ کشی موت ہے۔ حرکت تکمیل ذات میں معاون ہے اور تکمیل کائنات میں بھی جاری و ساری۔ دینی زندگی میں یہی عمل، اجتہادی فکر کو بروئے کار لانے کا عمل ہے۔ رسول پاک ﷺ کی ذات انسان کامل کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ اس آئیڈیل کو سامنے رکھ کر، بندہ خدا سے بھی رشتہ جوڑتا ہے اور کائنات سے بھی اپنا تعلق قائم رکھتا ہے۔ انفرادی نشوونما، اجتماعی نشوونما سے الگ نہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ کائنات بلامقصد وجود میں نہیں آئی، اعتدال اور توازن کا قانون ہر جگہ ایک اٹل قانون

فطرت ہے جسے اسلام نے بنیادی اہمیت دی ہے اور جس کے سہارے زندگی اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔

اعتدال کا قانون

اعتدال کے قانون کے تحت خودی کو جائز حدود میں رکھنے کی صلاحیت ضروری ہے۔ برے بھلے کی پہچان انسان کے اپنے اختیار میں ہے۔ انسان کو اختیار کی آزادی دی گئی ہے۔ اب یہ اس کا کام ہے کہ اچھے اور برے کے درمیان امتیاز کرے، خیر کی طرف راغب ہو اور شر سے اجتناب کرے۔ گویا انسان ہر وقت یوم الحساب میں ہے اور وہ اپنی قسمت کا خود ہی خالق ہے۔ خیر اور شر کی آویزش میں اپنے اختیار کو بروئے کار لا کر، فرد نیکی کی طرف بھی جا سکتا ہے اور بدی کی طرف بھی پیش قدمی کر سکتا ہے۔ لیکن اگر تصور توحید نمایاں ہے اور ذہن، وحدت فکر سے آشنا ہے تو اس کی زندگی وحدت کی طرف رواں ہو گی۔ اگر مکاں سے زماں کی طرف انسان کا رخ ہے اور اس کا قبلہ درست، تو عمل اور حرکت کی مدد سے وہ صحیح نتائج کا استخراج کر سکتا ہے، شرط یہ ہے کہ توازن کو نظر انداز نہ کرے اور اپنے بنیادی مقصد کے حصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھے۔

۳

اقبال کا تصور تعلیم پانچ بنیادی نتائج پر مشتمل ہے:

۱۔ علم کے ساتھ عمل اور تعلیم کے ساتھ تربیت ضروری ہے۔ محض تعلیم کوئی معنی نہیں رکھتی، جب تک تربیت اس کا لازمی حصہ نہ ہو۔ تربیت انسان کو معاشرے کا حصہ ہونے کا شعور عطا کرتی ہے اور اسے کردار کی پختگی دیتی ہے۔ علم اسے روشنی دیتا اور عمل اس کی اطلاقی صورت کو متعین کرتا ہے۔ علامہ علم و عمل دونوں کو تعلیمی سطح پر مربوط قرار دیتے ہیں۔ علم کے بغیر عمل ایک دو دھاری تلوار ہے جو خود تلوار چلانے والے کو بھی قتل کر سکتی ہے۔ علم اور عمل میں فاصلے منافقت پر منتج ہوتے ہیں اور یہی آج ہمارا مقسوم ہے۔ ہم آج اسی عذاب میں مبتلا ہیں اور اس سے نکلنے کا کوئی

راستہ دکھائی نہیں دیتا۔

۲۔ علامہ اقبال کے نزدیک خودی کے تین مراحل ہیں۔ اطاعت، ضبط نفس اور نیابت الٰہی۔ آخری درجہ مرد حر، مومن یا مرد قلندر کا ہے۔ یہی علامہ کا آئیڈیل انسان ہے۔ تعلیم کا مقصد تربیت کے ذریعے اس آئیڈیل کی تشکیل اور تعمیر ہے لیکن یہ فرد خلا میں سانس نہیں لیتا، بلکہ معاشرے کا حصہ بھی ہے۔

۳۔ فرد معاشرے کا حصہ ہونے کی حیثیت سے دو گونہ اہمیت رکھتا ہے۔ وہ معاشرے کو متاثر کرتا ہے اور معاشرہ بھی اس پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اچھا معاشرہ اچھے افراد پیدا کرے گا۔ علامہ اقبال اشتراکی تصور تاریخ کے قائل نہیں جس میں افراد اپنے آس پاس کی قوتوں کا کھلونا ہیں۔ ان کی رائے میں پختہ کردار کا انسان معاشرے کی شکل و صورت بدل بھی سکتا ہے۔ پلیخ نوف والے تصور تاریخ کو علامہ اقبال نے قبول نہیں کیا بلکہ وہ تو فکری طور پر اس حد تک آگے نکل جاتے ہیں کہ ان کی رائے میں ہر دور ایک نہ ایک مرد مومن سے رہنمائی حاصل کرتا ہے۔ یہ مرد مومن ہر معاشرے میں انقلابی تبدیلیاں لاتا ہے۔ اپنے خطوط میں اقبال نے ہر دور میں "ظہور مہدی" کا تصور پیش کیا ہے۔

مرد مومن کی تلاش میں مختلف ادوار میں مختلف عظیم شخصیتیں علامہ کے لیے پرکشش رہیں۔ ماضی کی فوجی شخصیتیں اقبال کے لیے عجیب طرح کے جذباتی لگاؤ کا باعث بنی ہیں۔ اورنگ زیب عالم گیر، ٹیپو سلطان اور صلاح الدین ایوبی ایسی شخصیتیں اقبال کا زندگی بھر پیچھا کرتی رہیں اور اقبال کے آئیڈیل معاشرے کی تشکیل نو میں بروئے کار رہیں۔ معاصرین میں اقبال کو کبھی تو مصطفیٰ کمال پاشا، کبھی رضا شاہ پہلوی، کبھی امان اللہ خاں، کبھی نادر شاہ (فرماں روائے افغانستان) اور کبھی قائد اعظم میں مرد حر کی صفات ملتی ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں اور پرکھتے ہیں اور جو شخصیتیں انھیں مایوس کر دیتی ہیں، بالآخر انھیں رد بھی کر دیتے ہیں

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روح شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

آخر قائد اعظم محمد علی جناح میں انھوں نے ایک سپاہی دریافت کر لیا جو برصغیر میں

مسلمانوں کو ایک آزاد ریاست کا جغرافیہ دے سکتا تھا۔ علامہ کے تصور تعلیم کا ایک مقصد اس طرح کے مردان حر کی پیدائش ہے۔

۴۔ فکری یک جہتی یا وحدت فکر کے عمل کو انسانی زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر حاوی کرنا ضروری ہے۔ توحید کے تصور کو سماجی زندگی میں متشکل کرنے کی یہی صورت ہے۔ اس اعتبار سے فرد میں فکری یک جہتی اسی وقت ممکن ہے جب جوش عمل رگوں میں سرایت کر گیا ہو۔ فکری یک جہتی جب تک متضاد قوتوں کو ایک لڑی میں نہ پروئے، حصول مقصد ممکن نہیں۔ اقبال کا آئیڈیل انسان جلال اور جمال کے درمیان ربط کا متقاضی ہے۔ وہ دین اور دنیا کے درمیان ربط پیدا کرتا ہے اور دنیا کو دین کے تابع رکھتا ہے۔ وہ اس کائنات میں خدا کا خلیفہ ہے اور اس لحاظ سے خیر کو شر پر حاوی رکھتا ہے۔ اقبال کے نزدیک معاشرتی زندگی میں یہ توازن، فکری وحدت کا پیش خیمہ ہے۔ مرد مومن اسی طرح کی صفات سے تشکیل پا کر اپنے نصب العین کی طرف سرگرم سفر ہے۔

یہ عمل خلا میں تکمیل نہیں پاتا۔ انسان اس دنیا کا باشندہ بھی ہے۔ اس کے اردگرد مادی زندگی کی وسعتیں بھی ہیں۔ وہ سماجی، اقتصادی اور تہذیبی قوتوں سے متعلق ہے۔ اس لحاظ سے وہ مسلسل جدوجہد اور مسلسل عمل میں معروف ہے۔ انسان مادیت اور روحانیت کے درمیان ایک سے زیادہ رشتے دریافت کرتا ہے۔ سماجی، اقتصادی اور تہذیبی قوتیں ایک حقیقت ہیں۔ انسان حقائق سے دوچار ہے۔ ان حقائق کو تسخیر کائنات میں استعمال کرنا ضروری ہے۔

۵۔ فرد کی تربیت سماجی عوامل کی دخل اندازی کے حوالے سے ہمیں پانچویں نکتے تک لے آتی ہے۔ فرد کی تربیت میں معاشرے کا کیا دخل ہے؟ فرد کس طرح معاشرے کو اعلیٰ اقدار کے لیے استعمال کر سکتا ہے؟ یہ وہ سوال ہیں جو اقبال کو مسلسل سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اسی کے گرد ان کا سارا فلسفیانہ نظام تشکیل پاتا ہے۔ وہ زندگی کو ترک کر کے گوشہ نشینی کے قائل نہیں۔ بلکہ وہ نظام تعلیم، جہاں ترک دنیا پر زور ہو، علامہ کے نزدیک زہر قاتل ہے۔ وہ تو اپنے تعلیمی نظام میں اس عنصر کے سب سے زیادہ خلاف ہیں، اسی لیے روایتی تصوف کو انھوں نے رد کر دیا کہ اس میں ترک دنیا پر زور

تھا۔ علامہ کے نزدیک معاشرے کا مقصد اعلیٰ اقدار کا تحفظ، اسلامی معاشرے کی تشکیل اور اس کی مدد سے وسیع تر انسانی معاشرے کی دریافت ہے۔ انھوں نے نکلسن کے نام اپنے خط میں اس اعتراض کے جواب میں کہ ان کی شاعری عالم گیر نہیں بلکہ اسلام کے ذکر کی بنا پر محدود ہے، فرمایا:

"مسٹر ڈکنسن نے آگے چل کر میرے فلسفے کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے اعتبار سے عالمگیر ہے لیکن باعتبار اطلاق و انطباق، مخصوص و محدود۔ ایک حیثیت سے ان کا ارشاد صحیح ہے۔ انسانیت کا نصب العین شعر اور فلسفے میں عالمگیر حیثیت سے پیش کیا گیا ہے لیکن اگر اسے موثر نصب العین بنانا اور عملی زندگی میں بروئے کار لانا چاہیں تو آپ شاعروں اور فلسفیوں کو اپنا مخاطب اولین نہیں ٹھیرائیں گے اور ایک ایسی مخصوص سوسائٹی تک اپنا دائرہ مخاطبت محدود کر دیں گے، جو ایک مستقل عقیدہ اور معین راہ عمل رکھتی ہو، لیکن اپنے عملی نمونے اور ترغیب و تبلیغ سے ہمیشہ اپنا دائرہ وسیع کرتی چلی جائے۔ میرے نزدیک اس قسم کی سوسائٹی اسلام ہے"۔

(اقبال نامہ، ج ۱، ص ۴۶۷-۴۶۸)

علامہ کی رائے میں اسلام ہی وہ مذہب ہے جو بنی نوع انسان کے لیے ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ چنانچہ آل احمد سرور کے نام ۱۲ مارچ ۱۹۳۷ء کو تحریر فرماتے ہیں:

"میرے نزدیک فاشزم، کمیونزم یا زمانہ حال کے اور ازم کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ میرے عقیدے کی رو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے جو بنی نوع انسان کے لیے ہر نقطۂ نگاہ سے موجب نجات ہو سکتی ہے"۔ (اقبال نامہ، ج ۲، ص ۳۱۴)

علامہ کے ہاں نظام تعلیم میں اسلام کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ مسلم سوسائٹی کا جو نقشہ علامہ اقبال نے پیش کیا، اس کا پورا خاکہ اسلام ہی کی تعلیمات پر مبنی ہے۔ وہ مذہبی تعلیم کی اہمیت کو فراموش نہیں کرتے بلکہ اسے نظام تعلیم میں ایک مرکزی حیثیت دینا چاہتے ہیں۔ ۷ جنوری ۱۹۲۹ء کو علامہ نے "سوراجیہ" کے نمائندہ خصوصی سے ملاقات کے دوران میں فرمایا:

میں اس امر کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس کر رہا ہوں کہ ہماری درس گاہوں میں مذہبی تعلیم بھی ہونی چاہیے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ میں بحیثیت ایک ہندوستانی کے،

مذہب کو سوراج پر مقدم خیال کرتا ہوں۔ ذاتی طور پر مجھے ایسے سوراج سے کوئی واسطہ نہ ہوگا جو مذہب سے بے نیاز ہو۔ یورپ میں تعلیم کا خالصتاً دنیوی طریق بڑے تباہی آمیز نتائج پیدا کرنے کا موجب ہوا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میرا ملک بھی ان تلخ تجربات سے دوچار ہو۔ یہ امر صاف ظاہر ہے کہ باشندگان ایشیا، یورپ کے خالص مادی رویے کو بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ ہمارے سامنے یہ مسئلہ درپیش ہے کہ روحانی اور مادی امور کو کس طرح ایک جگہ جمع کیا جائے۔ (گفتار اقبال، ص ۲۲۳، حاشیہ)

ان کے ذہن میں ایک ایسے معاشرے کا تصور ہے جس میں انسانیت کا احترام بنیادی قدر ہو گی اور نوع انسانی کی فلاح و بہبود اس کا مطمح نظر ہوگا، چنانچہ فرماتے ہیں:

جب تک تمام دنیا کی علمی قوتیں اپنی توجہ کو احترام انسانیت کے درس پر مرکوز نہ کر دیں، یہ دنیا بدستور درندوں کی بستی رہے گی۔ کیا ہم نے نہیں دیکھا کہ ہسپانیہ کے باشندے ایک نسل، ایک زبان، ایک مذہب اور ایک قوم رکھنے کے باوجود محض اقتصادی مسائل کے اختلاف پر ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں اور اپنے ہاتھوں اپنے تمدن کا نام و نشان مٹا رہے ہیں۔ اس ایک واقعے سے صاف ظاہر ہے کہ قومی وحدت بھی ہرگز قائم و دائم نہیں۔ وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے، جو رنگ و نسل و زبان سے بالاتر ہے۔ جب تک اس نام نہاد جمہوریت، اس ناپاک قوم پرستی اور اس ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو مٹایا نہ جائے گا، جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے الخلق عیال اللہ کے حصول کا قائل نہ ہو جائے گا، جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ و نسل نہ مٹایا جائے گا، اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کر سکے گا اور اخوت، حریت اور مساوات کے شاندار الفاظ شرمندہ معنی نہ ہوں گے۔ (حرف اقبال، ص ۲۲۷)

۴

علامہ کے بنیادی تصورات تک رسائی کے لیے دو اقتباس اہم ہیں: ایک قدیم اور جدید کے حوالے سے، اور دوسرا دین اسلام اور عام انسانی زندگی کے درمیان ربط کے

…لے سے، فرماتے ہیں:

میرے نزدیک اقوام کی زندگی میں "قدیم" ایک ایسا ہی ضروری عنصر ہے جیسا کہ "جدید" بلکہ میرا ذاتی میلان قدیم کی طرف ہے۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ اسلامی ممالک میں عوام اور تعلیم یافتہ لوگ، دونوں طبقے علوم اسلامیہ سے بے خبر ہیں۔ اس بے خبری سے آپ کی اصطلاح میں یورپ کے "معنوی استیلا" کا اندیشہ ہے، جس کا سد باب ضروری ہے۔ (اقبال نامہ، ج ا، ص ۱۴۸)

غلام قوم مادیات کو روحانیات پر مقدم سمجھنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اور جب انسان میں خوئے غلامی راسخ ہو جاتی ہے تو [وہ] ہر ایسی تعلیم سے بیزاری کے بہانے تلاش کرتا ہے جس کا مقصد قوت نفس اور روح انسانی کا ترفع ہو..... دین اسلام جو ہر مسلمان کے عقیدے کی رو سے ہر شے پر مقدم ہے، نفس انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا بلکہ ان کے عمل کے لیے حدود معین کرتا ہے۔ ان حدود کے معین کرنے کا نام اصطلاح اسلام میں شریعت یا قانون الہیٰ ہے۔ خودی خواہ مسولینی کی ہو خواہ ہٹلر کی قانون الہیٰ کی پابند ہو جائے تو مسلمان ہو جاتی ہے۔ مسولینی نے حبشہ کو محض جوع الارض کی تسکین کے لیے پامال کیا۔ مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانے میں حبشہ کی آزادی کو محفوظ رکھا۔ فرق اس قدر ہے کہ پہلی صورت میں خودی کسی قانون کی پابند نہیں۔ دوسری صورت میں قانون الہیٰ اور اخلاق کی پابند ہے۔

(اقبال نامہ، ج ا، ص ۲۰۱، ۲۰۲)

آخر میں دو مزید اقتباس علامہ کی فکر کی جہت کو متعین کرنے کے لیے ضروری ہیں۔

۴ مارچ ۱۹۲۷ء کو سائنس اور مذہب کے حوالے سے فرمایا:

مذہب، فلسفہ، طبیعیات اور دیگر علوم و فنون سب کے سب مختلف راستے ہیں جو ایک ہی منزل مقصود پر جا کر ختم ہوتے ہیں۔ مذہب اور سائنس کے تصادم کا خیال اسلامی نہیں کیونکہ سائنس یعنی علوم جدیدہ اور فنون حاضرہ کے باب کھولنے والے تو مسلمان ہی ہیں، اور اسلام ہی نے انسان کو منطق کا استقرائی طریق سکھایا اور علوم کی بنیاد نظریات اور قیاسات پر رکھنے کے طریق کو مسترد کرنے کی تعلیم دی۔ اور یہی بات علوم جدیدہ کی پیدائش کا موجب ہوئی --- مسلمانوں میں فرقہ معتزلہ اور دیگر

فرقوں کے درمیان جو تنازعہ پیدا ہوا تھا، وہ اس قسم کا نہ تھا، جو یورپ کے روشن دماغ علما اور تاریک خیال پادریوں کے درمیان پیدا ہوا، بلکہ وہ تو ایک علمی بحث تھی، جس کا موضوع محض یہ تھا کہ آیا ہمیں الہامی کلام ربانی کو عقل انسانی کے معیار پر پرکھنے کا حق حاصل ہے یا نہیں۔ (گفتار اقبال، ص ۲۳)

اپریل ۱۹۲۷ء میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس کے موقع پر علامہ نے "اسلامی کلچر کی روح" کے موضوع پر جو کچھ فرمایا، وہ جدید طرز فکر کے سلسلے میں بہت اہم ہے۔ فرماتے ہیں:

مکان و زماں اشیا کی حقیقت انسان سے پوشیدہ ہے۔ ہر انسان کے دل میں ایک ہوس ہے۔ ہر شخص کی یہ خواہش ہے کہ اسے نظام عالم کی حقیقت معلوم ہو جائے۔ یہود کا سوال "لن نومن حتی نری الله جهره" (ہم خدا پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک کہ اسے عیاناً نہ دیکھ لیں) اسی ہوس کا نتیجہ تھا۔ خود موسیٰ کلیم اللہ نے بھی، رب ارنی انظر الیک کی درخواست کی تھی۔ غرض مشاہدے کی ہوس عالمگیر ہے۔ میں نے اس خیال کو دو ایک اشعار میں سمجھایا ہے

خرد گفت او بچشم اندر نگنجد   نگاہ شوق در امید و بیم است
نمی گردد کہن افسانہ طور   کہ در ہر دل تمنائے کلیم است

موسیٰ علیہ السلام کی کہانی پرانی نہیں، آج بھی ہر شخص رب ارنی کہہ رہا ہے۔ حقیقت کا مشاہدہ دو طرح سے ہوتا ہے۔

حق تعالیٰ نے فرمایا: وجعل لکم اسمع والابصار و الافئده لعلکم تشکرون (۶۱-۳۰)

اس آیت میں حصول علم کے ذریعوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک ذریعہ تو سمع و بصر ہے اور دوسرا ذریعہ انسان کا قلب ہے، یعنی یہ نہ ہو کہ سمع و بصر کو چھوڑ کر کلی طور پر قلب کی طرف متوجہ ہو جاؤ اور ایسا بھی نہ ہو کہ قلب سے غافل ہو کر یورپ والوں کی طرح بالکل سمع و بصر کے ہو رہو۔ مسلمانوں نے اپنی توجہات قلب پر مرتکز کر دیں اور سمع و بصر سے پورا کام نہ لیا بلکہ ساری ایشیائی تہذیب کا خاصہ بھی ہے---

نظام عالم کی آفرینش یوں ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی نمو کے لیے یا اپنے آپ کو ظاہر و نمایاں کرنے کے لیے دنیا کو پیدا کیا۔ اس خط سفر کا آخری نقطہ عالم ظاہر ہے۔ اب حقیقت تک پہنچنے کی راہ یہ ہے کہ اس آخری نقطے سے الٹا سفر کیا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مظاہر کو چھوڑ کر حقیقت کی طرف متوجہ ہوں۔ اس کا مقصد یہ نہ ہونا چاہیے کہ انسان مشاہدۂ حقیقت کے ساتھ اپنے آپ کو فنا کر دے۔ اسلام کا عندیہ یہ ہے کہ حقیقت کا مشاہدہ مردانہ وار کیا جائے۔---

یہی اسلامی آئیڈیل ہے۔ اسلامی نقطہ خیال میں یہی معراج ہے کہ مشاہدۂ ذات کے بعد بھی عبودیت قائم رہے، لیکن تردو سرکشی کے لیے نہیں، بلکہ خدمت و عبدیت کے لیے۔ مسلم کو کسی چیز میں فنا نہ ہونا چاہیے گو یہ فنافی اللہ ہی کیوں نہ ہو۔ (گفتار اقبال، ص ۳۵،۲۴)

اقبال کا تصور تعلیم اور عصری صورت حال-۲

گزشتہ باب میں مذکورہ مباحث کی مدد سے لیکچر کے دوسرے حصے پر آتے ہیں۔ تعلیم کے اطلاقی پہلوؤں سے چند اہم سوال ہمارے سامنے آتے ہیں:

۱۔ نصابات کس طرح ترتیب دیے جائیں؟

۲۔ مغربی علوم اکثر ترقی کے نشانات ہیں تو انھیں قبول کرنا کس حد تک ضروری ہے یعنی مغربی علوم سے استفادے کا عمل کیا ہونا چاہیے؟

۳۔ نصاب کا متن کس مواد پر مشتمل ہونا چاہیے؟

۵۔ سائنسی ترقی اور مذہب ایک دوسرے کے خلاف جاتے ہیں یا ایک دوسرے کے مددگار ہیں؟

۶۔ سائنسی علوم اور دیگر جدید علوم کی معاشرے میں کیا اہمیت ہے؟

۷۔ مرد اور عورت کی تعلیم میں کیا فرق ہے اور آزادی نسواں وغیرہ کے مسائل کیا ہیں؟

۸۔ ذریعہ تعلیم کون سی زبان ہونی چاہیے؟

ان سوالات کو یک جا کر کے چار اہم امور میں گفتگو محصور ہو سکتی ہے:

- نصاب سازی کا طریق کار اور متعلقہ مسائل۔
- تعلیم نسواں اور دیگر امور۔
- قدیم و جدید علوم، عقل و عشق اور سائنس و مذہب۔

• ذریعہ تعلیم کا مسئلہ۔

ا

ان سوالوں کا جواب دینے سے پہلے تمہیداً دو باتوں کا ذکر ضروری ہے: اول یہ کہ علامہ اقبال سماجی زندگی کو اہمیت دیتے تھے اور اسے روحانی اقدار کے لیے استعمال بھی کرنا چاہتے تھے، اس لیے انھوں نے سماجی علوم کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ خصوصاً تاریخ کو ایک ایسا مضمون قرار دیا جو حال اور مستقبل سے مربوط اور زندگی کی سمت متعین کرنے میں کارگر ہے۔ ان کی نظر میں مسلمانوں کے لیے تاریخ کا مطالعہ ملی شناخت کا ناگزیر حصہ ہے۔ اسی حوالے سے انھوں نے جملہ مضامین کی درجہ بندی کی ہے۔

قرونِ وسطیٰ میں تعلیم ریاست کی ذمہ داری نہ تھی، بلکہ مسجدیں مرکزی اہمیت رکھتی تھیں، اور جملہ علوم و فنون کی نشوونما دینی علوم کے توسط سے ہوتی تھی۔ مطالعہ قرآن کو مرکزی اہمیت حاصل تھی۔ علوم حدیث اور دوسرے جملہ علوم اسی بنیادی کتاب کے گرد اپنا مقام متعین کرتے تھے۔ افراد اداروں سے زیادہ اہم تھے۔ یہ نظام برطانوی دور کے مقابلے میں زیادہ آزاد اور حکومتی اثرات سے پاک تھا۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں سرسید کی تحریک سے تعلیمی نظام میں بنیادی تبدیلی آئی۔ معاشرتی زندگی نئے دور میں داخل ہو گئی۔ پرانا جاگیردارانہ طبقہ زوال پذیر ہو کر مرکزی اہمیت کھو بیٹھا۔ اس کی جگہ ایک نئے ابھرنے والے متوسط طبقے نے لینی شروع کر دی۔ آئندہ چل کر مسلمانوں میں جو احیائی تحریکیں ابھریں، ان میں متوسط طبقے نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آئندہ سو سال تک یہی متوسط طبقہ جدید تعلیم کا نقیب رہا۔

پرانا نظام تعلیم مسجدوں اور دینی اداروں میں سمٹ کر رہ گیا۔ اب مسلمانوں کی معاشرتی زندگی دو دائروں میں بٹ گئی: ایک دائرہ جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کا تھا جو مغرب کے ترقی یافتہ اور مغربی علوم سے استفادہ کرتے ہوئے سماجی زندگی میں سرگرم کار تھے، دوسرا طبقہ دینی عالموں کا تھا جو پرانے نصابات پڑھاتے تھے اور مغربی علوم سے ناآشنا تھے۔ اس طبقے کی آواز عوام میں جاری و ساری رہی۔ عملاً مسلمان انھی دو طبقوں میں تقسیم ہو کر

رہ گئے۔ یہ الگ الگ دنیاؤں کے باشندے تھے اور ایک دوسرے سے بالکل ناواقف۔ نئے علوم اور نئی سائنسی ترقیات کے زیر سایہ متوسط طبقے نے مسلمانوں کی عمومی رہنمائی کا فریضہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مسلم معاشرے میں بنیادی تبدیلیوں کے ذریعے اسے فعال بنایا۔

علامہ اقبال خود ابتدائی چند برس قدیم طرز کے مدرسوں میں پڑھتے رہے، پھر انگریزی تعلیم کی طرف آ گئے۔ انھیں دونوں نظاموں کی خامیوں اور خوبیوں کا ذاتی تجربہ تھا۔ تاہم ان کی سوچ میں مغرب سے آنے والے علوم کا حصہ زیادہ تھا۔ انھوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ دونوں دائروں کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے۔ مغربی نوجوانوں کو مذہبی اور دینی تعلیم سے آشنا کیا جائے اور طبقہ علما کو جدید علوم سے آگاہ کر کے فعال بنایا جائے۔

عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ علامہ اقبال، علمائے دین کے خلاف تھے، یہ صحیح نہیں۔ انھوں نے علمائے دین کا ہمیشہ احترام کیا اور ان کی اہمیت کو ہمیشہ تسلیم کیا۔ محفل میلاد النبی والے مقالے میں یہ کہا کہ تعلیم سے زیادہ اس قوم کو تربیت کی ضرورت ہے اور ملی اعتبار سے یہ تربیت علما کے ہاتھ میں ہے۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ میری ذاتی رائے میں اکبری الحاد کے خلاف جو آواز برصغیر میں اٹھائی گئی اور مغلیہ عہد میں اسلام عام مسلمانوں میں برقرار اور بحال رہا تو یہ کارنامہ بھی علما ہی نے ادا کیا تھا۔ سیرت رسول ﷺ اور علم حدیث کے ذریعے یہ عظیم کارنامہ انجام دیا گیا۔

یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ اسی طبقے میں علما سوء بھی شامل ہو گئے ہیں جنھیں علامہ نے "ملا" سمجھا ہے اور ان کی بھرپور مخالفت کی۔ مغربی تعلیم یافتہ نوجوانوں میں الحاد کی جو لہر چل رہی تھی، علامہ اس کے بھی سب سے بڑے مخالف تھے۔ انھوں نے "ملا" اور "مسٹر" دونوں کو رد کیا۔ ان کا آئیڈیل مسلمان تو وہ ہے جو مغربی علوم سے استفادہ کرتا ہے اور دین کی رسی بھی مضبوطی سے پکڑتا ہے۔ وہ ایک طرف تو دینی مدرسوں کو جدید علوم سے آراستہ کرنا چاہتے ہیں اور حکومت کے تسلط سے آزاد تعلیم کے حامی ہیں اور دوسری طرف متوازی سرکاری تعلیمی نظام کو بھی مذہبی تعلیم سے آشنا کر کے مسلمان کرنا چاہتے ہیں۔

دین کی تعلیم سرکاری مدارس میں ممکن نہ تھی، لیکن ملحقہ کالجوں اور مدارس میں (جو انجمنیں اور ادارے چلا رہے تھے) دینی تعلیم کو شامل کرنے کی مہم علامہ نے شروع کی۔ انجمن حمایت اسلام کی قائم درس گاہوں میں یہ کوشش کی گئی۔ حتیٰ کہ ۱۹۱۸ء میں ملت بیضا پر

ایک عمرانی نظم میں ہندستان میں ایک الگ مذہبی یونیورسٹی کا تصور بھی دیا۔ فرماتے ہیں:

ایک قلیل البضاعت مسلمان جو سینے میں ایک درد بھرا اسلامی دل رکھتا ہو، میری رائے میں قوم کے لیے بمقابلہ اس بیش قرار تنخواہ پانے والے آزاد خیال گریجویٹ کے، زیادہ سرمایہ نازش ہے، جس کی نظروں میں اسلام اصول زندگی نہیں ہے بلکہ محض ایک آلہ جلب منفعت ہے، جس کے ذریعے سے بڑے بڑے سرکاری عہدے زیادہ تعداد میں حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ میری ان باتوں سے یہ خیال نہ کیا جائے کہ میں مغربی تہذیب کا مخالف ہوں۔ اسلامی تاریخ کے ہر مبصر کو لامحالہ اس امر کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ ہمارے عقلی اور ادراکی گہوارے کو جھلانے کی خدمت مغرب ہی نے انجام دی ہے۔ فلسفیانہ تخیل کی سرزمین میں ہم شاید ابھی تک بجائے عربی اور ایرانی ہونے کے، زیادہ تر یونانی نظر آرہے ہیں۔ بایں ہمہ اس سے کسی کو انکار نہ ہوگا کہ خود ہماری خالص اسلامی تہذیب اپنی مثال آپ ہے اور تعلیم کا کوئی جدید اسلامی نظام متعلمین کی قومیت پر حرف لائے بغیر اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اسلامی یونیورسٹی کے خیال کا ہمارے دل میں پیدا ہونا حقیقت میں ہماری قومی ہستی کے حق میں ایک مبارک علامت ہے۔ جب ہم اپنی قوم کی نوعیت پر نظر ڈالتے ہیں تو اس قسم کے دار العلم کی ضرورت میں شک اور شبے کی مطلق گنجائش نہیں رہتی، بشرطیکہ یہ دار العلم ٹھیٹھ اسلامی اصول پر چلایا جائے۔ کوئی قوم اس رشتے کو یک بیک نہیں توڑ سکتی جو اسے اس کے ایام گزشتہ سے جوڑے ہوئے ہے اور مسلمانوں کے لیے تو اس تعلق کو چھوڑ دینا اور بھی محال ہے، جن کی مجموعی روایات ان کی قومیت کی جان ہیں۔ مسلمانوں کو بے شک علوم جدیدہ کی تیز پا رفتار کے قدم بہ قدم چلنا چاہیے لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی تہذیب کا رنگ خالص ہو۔ اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ایک ایسی یونیورسٹی موجود نہ ہو، جسے ہم اپنی قومی تعلیم کا مرکز قرار دے سکیں۔ ہم کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اگر ہماری قوم کے نوجوانوں کی تعلیمی اٹھان اسلامی نہیں ہے تو ہم اپنی قومیت کے پودے اسلام کو آب حیات سے نہیں سینچ رہے ہیں اور اپنی جماعت میں پکے مسلمان کا اضافہ نہیں کر رہے ہیں، بلکہ ایسا نیا گروہ پیدا

کر رہے ہیں، جو بوجہ کسی اکتنازی یا اتحادی مرکز کے نہ ہونے کے، اپنی شخصیت کو کسی دن کھو بیٹھے گا اور گرد و پیش کی ان قوموں میں سے کسی ایک قوم میں ضم ہو جائے گا، جس میں اس کی بہ نسبت زیادہ قوت و جان ہو گی۔

لیکن ہندوستان میں اسلامی یونیورسٹی کا قائم ہونا ایک اور لحاظ سے بھی نہایت ضروری ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ہماری قوم کے عوام کی اخلاقی تربیت کا کام ایسے علما اور واعظ انجام دے رہے ہیں جو اس خدمت کی انجام دہی کے پوری طرح سے اہل نہیں ہیں۔ اس لیے کہ ان کا مبلغ علم اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم کے متعلق نہایت ہی محدود ہے۔ اخلاق اور مذہب کے اصول و فروع کی تلقین کے لیے موجودہ زمانے کے واعظ کو تاریخ، اقتصادیات اور عمرانیات کے حقائق عظیمہ سے آشنا ہونے کے علاوہ اپنی قوم کے لٹریچر اور تخیل میں پوری دسترس رکھنی چاہیے۔ الندوہ، علی گڑھ کالج، مدرسہ دیوبند اور اس قسم کے دوسرے مدارس جو الگ الگ کام کر رہے ہیں، اس بڑی ضرورت کو رفع نہیں کر سکتے۔ ان تمام بکھری ہوئی تعلیمی قوتوں کا شیرازہ بند ایک وسیع تر اغراض کا مرکزی دارالعلم ہونا چاہیے، جہاں افراد قوم، نہ صرف خاص قابلیتوں کو نشوونما دینے کا موقع حاصل کر سکیں بلکہ تہذیب کا وہ اسلوب یا سانچہ تیار کیا جا سکے جس میں زمانہ موجودہ کے ہندوستانی مسلمانوں کو ڈھالنا چاہیے۔ پس یہ امر قطعی طور پر ضروری ہے کہ ایک نیا مثالی دارالعلم قائم کیا جائے جس کی مسند نشین اسلامی تہذیب ہو اور جس میں قدیم و جدید کی آمیزش عجب دل کش انداز سے ہوئی ہو۔ اس قسم کی تصویر مثالی کھینچنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے اعلیٰ تخیل، زمانے کے رجحانات کا لطیف احساس اور مسلمانوں کی تاریخ اور مذہب کے مفہوم کی صحیح تعبیر لازمی ہے۔

(مقالات اقبال، ص ۱۳۶-۱۴۴)

علامہ، تعلیمی نظام میں دو طرفہ اصلاح کر کے اور اسے مربوط کر کے ایک جامع نظام تعلیم وضع کرنے کا شدید احساس رکھتے تھے۔

ہمارا معاشرتی دوغلاپن ہی ہماری جملہ خرابیوں کا اصل سبب ہے اور علامہ اقبال اسی کو دور کرنا چاہتے ہیں۔

۲

اگر آج کی سماجی زندگی کو سامنے رکھیں تو پاکستان میں نظام تعلیم طبقاتی تضاد کا شکار ہے۔ ۱۹۵۸ء کے بعد اقتصادی اور صنعتی ترقی نے ہمارے معاشرے کو بڑی حد تک بدلنا شروع کر دیا۔ ۱۹۷۰ء کے بعد سے اس کی رفتار میں بہت تیزی آئی۔ نتیجہ یہ کہ ہمارا معاشرہ پوری طرح دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ اقتدار کی زمام جو پہلے متوسط طبقے کے ہاتھ میں تھی، رفتہ رفتہ دولت مند طبقے کے ہاتھ میں چلی گئی۔ سوسائٹی میں امیر کے امیر تر اور غریب کے غریب تر ہونے کا عمل شروع ہو چکا ہے۔ آج درمیانہ طبقہ نہ ہونے کے برابر ہے اور معاشرتی زندگی میں راہ نما حیثیت نہیں رکھتا۔ حکومت کا نظم و نسق دولت مند طبقے کے ہاتھ میں ہے۔ ملک کی زیادہ آبادی غریب ہے جس کا بڑا حصہ دیہات میں بستا ہے۔ ۷۴ فی صد دیہاتی ہیں اور ۲۶ فی صد شہری۔

عمودی تقسیم کے لحاظ سے معاشرہ امیر اور غریب میں منقسم ہے۔ اہل ثروت حاوی ہیں اور غریب نان جویں کے محتاج۔ تعلیم شہروں میں بھی دو حصوں میں بٹ چکی ہے۔ امیر اور اوپر کا متوسط طبقہ انگلش میڈیم اسکولوں سے آ رہا ہے اور غریب اور نچلا متوسط طبقہ اردو میڈیم سے ہے۔ ذریعہ تعلیم کا مسئلہ سیاسی سے زیادہ اب طبقاتی شکل اختیار کر چکا ہے۔ یہ معاشرتی تبدیلی زمانہ حال کی پیداوار ہے۔ علامہ کے دور میں صرف متوسط طبقے کی حکمرانی تھی اور اس وقت زندگی اتنی پیچیدہ بھی نہ تھی، جتنی اب ہے۔

علامہ کے تصورات کو موجودہ دور پر منطبق کرتے ہوئے ہمیں ان معاشرتی حقائق کو پیش نظر رکھنا ہو گا جو ہماری سماجی زندگی میں ظہور پذیر ہو چکے ہیں۔ سیاہ و سفید کا مالک دولت مند طبقہ مغربی تعلیم اور مغربی طرز بود و باش کا دلدادہ ہے، جس میں اخلاقی قدروں کی کوئی اہمیت نہیں۔ غریب طبقہ تعلیم سے پوری طرح بہرہ ور نہیں اور معاشرتی تضاد کا شکار ہے۔ اس لیے لازمی تعلیم کے وہ قوانین عملاً رائج نہیں ہو سکے جن کی بنا پر تعلیم ہر آدمی کا پیدائشی حق قرار پاتی ہے۔ تعلیم خواص کا حق ہو گئی ہے اور اس کے لیے خواص کے الگ ادارے بھی قائم ہیں۔ معاشرے میں بے اطمینانی بڑھ گئی ہے، جس کا علاج تعلیمی سطح پر

بھی مطلوب ہے۔

۳

علامہ اقبال جبری تعلیم کے حامی تھے۔ ۱۸ فروری ۱۹۱۲ء کو حبیبیہ ہال، لاہور میں مسٹر گوکھلے کی تجویز کی تائید میں جو جلسہ ہوا، اس کی صدارت علامہ اقبال نے فرمائی تھی۔ یہ ایک لحاظ سے جبری تعلیم پر تیسرا جلسہ تھا۔ لازمی تعلیم کے بل کا لفظ "جبر" زیر بحث تھا۔ علامہ اقبال اس جبر کے حامی ہیں۔ ان کی رائے میں مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آشنا کرنے کے لیے جبری تعلیم ضروری ہے۔ اس قانون کا براہ راست اثر سرکاری طور پر چلنے والے اداروں کے علاوہ مسلمانوں کے ان اداروں پر پڑتا تھا جو انجمن حمایت اسلام اور بعض دوسری جماعتیں ملک کے طول و عرض میں چلا رہی تھی۔ علامہ اس حق میں تھے کہ جبری پرائمری تعلیم کو رائج کیا جائے، فرماتے ہیں:

لفظ "جبر" سے کسی کو کھٹکنا نہ چاہیے۔ جس طرح چیچک کا ٹیکہ لازمی اور جبری قرار دیا گیا ہے اور یہ لزوم و جبر اس شخص کے حق میں کسی طرح مضر نہیں ہو سکتا جس کے ٹیکہ لگایا جاتا ہے، اسی طرح جبریہ تعلیم بھی قابل اعتراض متصور نہیں ہو سکتی۔ جبریہ تعلیم بھی گویا روحانی چیچک کا ٹیکہ ہے۔ اسلام میں جبر کی تعلیم موجود ہے۔ مسلمانوں کو حکم ہے کہ اپنے بچوں کو زبردستی نماز پڑھائیں۔ بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس جبریہ تعلیم کے قانون کی حد میں لڑکیاں بھی آ جائیں گی، مگر ہم چاہیں تو اس شق کو قانون سے نکلوانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ (گفتار اقبال، ص ۴)

علامہ جب پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ممبر ہوئے، اس زمانے میں انھوں نے پنجاب میں جبری تعلیم کو عملاً نافذ کرنے پر شدت سے اصرار کیا۔ اس کی تفصیلات علامہ کی پنجاب کونسل کی تقاریر میں موجود ہیں۔ لازمی تعلیم کے قانون کی منظوری کے بعد، اسے موثر طور پر نافذ کرنے کی طرف توجہ نہیں کی گئی تھی، اس لیے علامہ نے لازمی تعلیم کا سوال شد و مد سے اٹھایا تھا۔

۴

اب ہم نصابات کے اخلاقی پہلوؤں پر گفتگو کرتے ہیں۔

علامہ نے ابن خلدون کی طرح تعلیمی ادوار کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے:

- بچوں کی تعلیم و تربیت
- پرائمری سے میٹرک تک کا دور
- ثانوی اور اعلیٰ تعلیم
- تحقیق

تعلیم کی تکمیل کے بعد علامہ خود استاد رہے۔ کالج کی سطح تک تدریس کا انھیں براہ راست تجربہ ہوا۔ وہ ۱۳ مئی ۱۸۹۹ء کو اورینٹل کالج لاہور میں تدریس کے فرائض انجام دینے لگے اور درسی کتب کی تدوین بھی کرتے رہے۔ گورنمنٹ کالج اور اسلامیہ کالج میں بھی وہ مختصر وقفوں سے تدریس میں شریک رہے۔ تاریخ، فلسفہ، سیاست مدن کی تعلیم ان کے فرائض میں شامل تھی۔ ان کی اس زمانے کی تصانیف میں علم الاقتصاد بھی ہے جو علامہ کا پہلا تحریری کارنامہ تھا۔ ۱۹۰۵ء تک وہ گورنمنٹ کالج کے استاد رہے اور انگریزی ادب و شاعری، فلسفہ اور تاریخ کے مضامین سے بھی متعلق رہے۔ پھر ۱۹۱۸ء میں کچھ عرصہ اسلامیہ کالج میں فلسفے کی تدریس بھی کی۔ جب وکالت شروع کی تو اس زمانے میں بھی نصاب سازی میں یونیورسٹی کے مختلف مضامین میں ان کی شرکت بدستور رہی۔ عربی، فارسی اور تاریخ، یہ وہ میدان تھے جن میں علامہ اقبال کی براہ راست دلچسپیاں رہیں۔

(ڈاکٹر ملک حسن اختر، اقبال:ایک تحقیقی مطالعہ، ص۸۵ تا ۱۴۵ تا ۳۱۹)

بچوں کی تعلیم و تربیت کے عنوان سے رسالہ مخزن جنوری ۱۹۰۲ء میں انھوں نے ایک مضمون لکھا اور پرانے طریقہ تعلیم پر اعتراض کیا (مقالات اقبال ص ۱ تا ۹) کہ "اس میں بچوں کے قوائے عقلیہ اور واہمہ کے مدارج نمو کو پیش نظر نہیں رکھا گیا"۔ اس نظام کو سخت مضر قرار دیتے ہوئے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے بعض بنیادی نکات بیان کیے ہیں۔ اس مضمون میں انھوں نے تعلیم کو تربیت سے الگ نہیں کیا اور پورا زور اس بات پر

صرف کیا ہے کہ تربیت کو اولین اہمیت حاصل ہے۔ پھر طریقہ تعلیم کے علمی اصول بیان کرتے ہوئے "آغاز عالم طفلی" کو زیر بحث لاتے ہیں۔ بچوں کی "اضطراری حرکت کے میلان" کو پیش نظر رکھتے ہوئے انھوں نے قوا کی حرکات کو تعلیمی فائدے کے لیے استعمال کی ترغیب دی ہے۔ "مثلاً" اینٹوں کے گھر بنانا، لڑی میں منکے پرونا، گانا وغیرہ" کے ذریعے بچے کی نشوونما پر زور دیا۔ وہ "زائد اعصابی قوت" کو (جو رونے اور بے جا شور کرنے میں صرف ہوتی ہے) باقاعدہ تصویر یا راگ میں منتقل کرنے پر زور دیتے ہیں، نیز جو قوت "ضرر رساں اشیا کو چھونے اور چیزوں کو ادھر ادھر پھینکنے میں صرف ہوتی تھی، اسے (انھوں نے) گھر بنانے میں صرف کرنے "کا مشورہ دیا ہے۔

بچے کی نفسیات کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ "بچہ مسلسل توجہ نہیں کر سکتا" اس لیے ان کا مشورہ ہے کہ "سبق طویل نہ ہوں، چھوٹے چھوٹے حصوں میں منقسم ہوں، ہر سبق میں ایک خاص مشترک بات ہو، تاکہ ایک خاص مقام پر توجہ لگانے کی عادت بھی ترقی کرتی جائے"۔

بچوں کی قوت مشاہدہ کے حوالے سے انھوں نے زور دیا ہے کہ "پانچوں حسیں تین مہینے کے بچے میں بیدار ہونے لگتی ہیں۔ سبق پڑھاتے ہوئے جس شے کا بتایا جائے، بچے کے ہاتھ میں دی جائے، مشاہدہ سے بصر کی تربیت ہوتی ہے، چھونے سے لمس کی اور گفتگو یا راگ سے سماعت کی۔ لمس اور بصر کے استعمال سے اشیا کا ادراک پیدا ہو گا"۔

بچے کو صورت سے چل کر رنگ کی طرف لے جانا بھی ضروری ہے۔ "شوخ رنگ بچوں کو پسند ہیں (اس لیے) رنگین تصویریں بچے کے لیے درسی کتابوں میں ضروری ہیں"۔

"بچے دوسروں کی نقل کرتے ہیں" اس سے بھی فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔ "استاد اپنی مثال بچے کے سامنے پیش کرے تاکہ اس کے ہر فعل کی نقل کرنے کی تحریک ہو"۔ اس کے علاوہ "بچے کی قوت واہمہ تشکیل پاتی رہے"۔

اخلاقی تربیت پر بھی علامہ خاص طور سے توجہ دلاتے ہیں۔ ہمدردی کے متعلق عمدہ عمدہ کہانیاں سنانا اور یاد کروانا، حیوانوں کے متعلق سبق دیتے ہوئے اچھا سلوک کرنے کی مثال پیش کرنا۔ قوت متمیزہ کی ترقی کے لیے شے اور شکل کا الگ الگ تصور دیا جائے۔ مثلاً گیند کا دوسری پہلو دار شے سے مقابلہ کر کے اس کے باریک باریک اختلافات واضح کیے جائیں۔

بچے کے قوائے عقلیہ یعنی تصدیق اور استدلال کمزور ہوتے ہیں۔ اس سے ایسے تصورات کے علم کی توقع نہیں رکھنی چاہیے --- جس ضمنی مدرکات کا علم ہی اس کو نہیں --- مثلاً ایک برس کے بچے کو حب وطن کا مجرد تصور یا خدا کی صفات کا تصور ذہن نشین نہیں ہو سکتا۔ یہ قوا وقت کے ساتھ ساتھ ترقی کرتے ہیں۔

اخلاقی محرکات سے بچہ عموماً کوئی اثر نہیں لیتا۔ اس اثر کو عملی زندگی کے دائرے میں ظاہر کرنا اعلیٰ درجے کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے۔ اس لیے بچے میں اخلاقی تحریکوں سے متاثر ہونے کی قابلیت پیدا کرنی چاہیے۔ نفس ناطقہ قوا کا ایک مجموعہ نہیں ہے بلکہ یہ اپنی ذات میں ایک واحد غیر منقسم شے ہے۔ ہر ایک قوت کی نشوونما ہر دوسری قوت کے نشوونما پر منحصر ہے۔ جس طرح جسمانی اعضا بڑھتے ہیں، اسی طرح نفس ناطقہ کے تمام قوا بھی بڑھتے ہیں۔ ادراک، تخیل، تاثر اور مشیت وغیرہ، ہر قوت کو تحریک دینے کی ضرورت بہرحال رہتی ہے۔

علامہ نے ابتدائی تعلیم و تربیت کے لیے اس مضمون میں جو سانچہ مہیا کیا ہے، اس میں نفسیات کے علم سے فائدہ اٹھایا ہے۔ کنڈر گارٹن کے تصورات ان کے ہاں شاید جرمنی کی رہائش کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس نظام میں اخلاقی پہلو انھوں نے خود سے شامل کیا ہے کیونکہ وہ اخلاقی اور دینی تربیت کو لازمہ تعلیم جانتے تھے۔ ان کی رائے میں:

مذہب قوم میں ایک متوازن سیرت پیدا کرتا ہے جو حیات ملی کے مختلف پہلوؤں کے لیے بیش بہا ترین سرمائے کی حیثیت رکھتا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی یورپ نے اپنے باشندوں کی تعلیم و تربیت میں سے مذہب کا عنصر حذف کر دیا ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس بے لگام انسانیت کا کیا حشر ہوگا۔ (اقبال نامہ، ص ۲۸۲)

ایک اور اہم نکتے پر علامہ نے خاص توجہ کی وہ تعلیم اور تعلم کو "مادری زبان" کے وسیلے سے سکھانے کا طریقہ ہے۔ یاد رہے کہ ۱۹۰۲ء میں علامہ نے "مادری زبان" کی ترکیب استعمال کی تھی۔ آگے چل کر ساری زندگی "مادری" کا لفظ استعمال نہیں کیا، کیونکہ اس کا رشتہ قومیت کے مغربی تصور سے وابستہ ہو جاتا تھا۔ ان کے لسانی تصور میں زبانیں محض استعمال کی چیز ہیں، پوجا کی نہیں۔ وہ مغربی زبانوں کو اپنے ملک میں ذریعہ تعلیم بنانے کے حق میں نہیں، کیونکہ نفسیاتی طور پر اپنی زبان کے وسیلے سے جو گرفت مطالب پر ہوتی ہے وہ

غیر زبان میں ممکن ہی نہیں۔

۵

۱۹۰۲ء سے لے کر ۱۹۱۲ء تک علامہ کی سوچ میں کچھ بنیادی تبدیلیاں آئیں۔ قومیت کے مغربی تصور کو انھوں نے بالکل خیر باد کہہ دیا اور اس کی جگہ ملت کا تصور اختیار کر لیا۔ اس زمانے میں شخصیت کی تعمیر کے حوالے سے خودی کا تصور اپنی تمام تر تفصیلات کے ساتھ ان کی توجہ کا مرکز ہو گیا۔ اس کا اظہار انھوں نے اپنے مضامین اور مکاتیب میں جا بجا کیا ہے۔

یہ وہ دور ہے جب وہ درسی کتابوں کی تدوین میں بھی مصروف ہوئے، لیکن اس وقت ہندستان میں درسی کتابیں پڑھنے والے ہندو اور سکھ اور دیگر مذاہب کے لوگ بھی تھے، اس لیے ان میں وہ اپنے عقائد کو پوری طرح پیش نہیں کر پائے۔

اردو زبان میں تاریخ ہند کا جو سلسلہ ان کے نام کے اشتراک سے ملتا ہے (۱۹۱۳ء)، ان کا اپنا تیار کیا ہوا نہیں لگتا، بلکہ صرف ان کا نام برتا گیا ہے (اقبال ایک تحقیقی مطالعہ، ۱۹۸۸ء، ص ۱۶۴) یہ شاید ان کی مالی مجبوری تھی، لیکن اردو میں جو سلسلہ ادبیہ کے عنوان سے سلسلہ کتب دستیاب ہے اور پانچویں، چھٹی، ساتویں اور آٹھویں کے لیے درسی کتاب کے طور پر تیار ہوا، وہ البتہ ان کی عملی شرکت کا غماز ہے۔ اس میں حکیم احمد شجاع شریک مصنف تھے۔ ان کتابوں میں ہندو طلبہ بھی پیش نظر ہیں۔ یدھشٹر، راجہ ہریش چندر، راجا مایاداس، سنجوگتا، رام چندر جی کا بن باس، رام شاستر، دروپدی، دادا بھائی نوروجی، والمیک وغیرہ پر اسباق اور نظمیں ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ علامہ نے عام اخلاقی مسائل: قناعت، موعظہ حسنہ، اخلاقی جرأت، ایمان کا فیصلہ، خدمت خدا و خلق، عزت، اور مسلمان بادشاہوں اور شہزادیوں، شیر شاہ سوری، بابر، شاہ جہان، تاج محل اور شہنشاہ اکبر کے حالات اور حب الوطنی کے تصورات بھی شامل کیے ہیں۔ مسلمانوں کی تہذیبی زندگی کی جھلکیوں کے علاوہ میرا وطن بھی شامل ہے۔ تصور وطنیت میں یہ غور طلب ہے کہ اس میں دھرتی پوجا کا درس نہیں دیا گیا۔

ہر کتاب میں ایک دیباچہ بھی ہے جس میں مولفین نے اپنے طریقہ کار کی وضاحت کی

ہے۔ "اردو کی مروجہ درسی کتابوں میں (انھیں) نفس مضمون، انداز تحریر اور طریقہ انتخاب کے حوالے سے زمانہ حال کے مطالبات" پورے ہوتے نظر نہیں آتے۔ پرانے اساتذۂ فن کے مقابلے میں زمانہ حال کے انشا پردازوں اور شاعروں کے مضامین نظم و نثر کی شمولیت، ایک اہم تبدیلی تھی۔

اس سے قبل تدریس اردو میں کلاسیکی نثر پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی جس سے قدیم ادبی زبان تو آجاتی تھی لیکن زبان کو بطور ایک زندہ اور قابل استعمال ذریعہ اظہار پس پشت ڈال دیا جاتا تھا۔ علامہ کی درسی کتب میں باغ و بہار کے اقتباسات یا سب رس میں سے انتخاب شامل نہیں، کیونکہ اس سطح پر اردو کی تدریس کا مقصد ایک زندہ زبان کے طور پر پڑھانا اور مختلف علوم میں طالب علموں کی استعداد بڑھانا تھا۔ اس لیے ان اسباق میں: سائنس کے کرشمے، وہیل مچھلی اور بعض دوسرے موضوعات داخل کیے گئے ہیں۔

ان میں اخلاقی پہلو نمایاں ہے۔ مقصد یہ تھا کہ کتاب کے وسیلے سے اخلاقی اور دینی رجحان کو تقویت دی جائے، اس لیے اخلاقی اور دینی باتوں پر بھی مناسب زور دیا گیا ہے۔

نصابی کتب کی زبان کی اصلاح پروفیسر شاداں بلگرامی نے کی۔ اردو تدریس کے نقطۂ نظر سے تین کتابوں کے اسباق پر نظر ثانی کا کام شیخ عبدالمجید پروفیسر سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور نے انجام دیا تھا۔

۶

علامہ نے نویں دسویں کے لیے آئینہ عجم بھی ترتیب دی جس کا سال اشاعت بقول ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ۱۹۲۶ء اور بقول عبدالجبار شاکر ۱۹۲۷ء ہے۔ ڈاکٹر ملک حسن اختر کی تحقیق کے مطابق یہ کتاب پہلی بار ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی (ایضاً، ص ۱۲۳) اور یہی اطلاع درست ہے۔

مدت سے علامہ کا ارادہ تھا کہ فارسی نصاب ترتیب دیا جائے، اس میں دوہرے مقاصد تھے، فارسی زبان کو بطور ایک زندہ زبان کے پڑھانا اور قدیم علمی سرمائے کی بازیافت اور ادبی روایات کا استحکام۔ پروفیسر محمد اکبر منیر سے علامہ نے خاص طور پر فرمائش کی کہ وہ ان

کے لیے ایران کے جدید شعرا اور نثر نگاروں کی بعض کتابیں لائیں۔ فرماتے ہیں:

عرصے سے میرا ارادہ ایک انٹرنس کورس فارسی ترتیب دینے کا ہے۔ جدید فارسی نظم و نثر کے کچھ عمدہ اور آسان نمونے مل جائیں تو یہاں کے طلبہ کے لیے نہایت مفید ہوگا۔ اگر آپ کو چند ایسی کتب نظم و نثر مل جائیں، تو میرے لیے خرید کر لیجیے، نظمیں مشہور اساتذۂ حال کی ہوں اور سلیس اور آسان طرز جدید میں لکھی گئی ہوں تو زیادہ مناسب ہے۔ پولیٹیکل نظموں کی ضرورت نہیں ...... غرض کہ آپ یہاں انٹرنس کے طلبہ کی ضروریات کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ میرا مقصود یہ ہے کہ فارسی کے ذریعے سے بھی جدید خیالات و احساسات طلبائے ہند تک پہنچیں۔ انگریزی کورسوں میں مضامین کا تنوع نہایت دلچسپ ہوتا ہے۔ انتخاب میں وہ بھی زیر نظر رہے۔

(کلیات مکاتیب اقبال، ج ۲، ص ۳۲۲، مکتوب مورخہ ۳۰ جنوری ۱۹۲۲ء)

نظموں میں انھوں نے مناظروں والے اقتباسات کو زیادہ اہمیت دی ہے یا پھر ایسی نظموں کو جن میں منظر کشی پر زور ہے۔ نصاب میں علامہ نے دو نظمیں اپنی بھی شامل کیں جن میں درس عمل دیا گیا تھا۔ سعدی، انوری، فردوسی اور عماد کا کلام بھی ہے، جس میں اخلاقی لون توجہ طلب ہے۔ عصر حاضر کے شاعروں میں وہ اپنے علاوہ ایک آدھ کو ہی شامل کر پائے ہیں۔ سبب شاید یہ ہے کہ ہندوستان میں انھیں جدید شعرا کا کلام دستیاب نہیں تھا۔

موجودہ شکل میں نثری حصے میں ان کے پیش نظر ایران کی معاشرت اور جغرافیہ ہے تاکہ برصغیر کا طالب علم ایرانی زندگی سے آشنا ہو جائے۔ سید محمد علی جمال زادہ کا "ملت و دولت ایران" محمود طرزی کا افسانہ "ماطلید" مالکم خان کا ڈرامہ "سرگزشت شاہ قلی مرزا" اور سیاحت نامہ، ابراہیم بیگ کے دو اقتباس (قزوین اور مراغہ کے بارے میں) شامل ہیں۔ نثر میں انھوں نے صرف جدید نثر پر بھروسہ کیا ہے اور قدیم نمونے شامل نہیں کیے۔

صحیح صورت حال یہ ہے کہ علامہ نے پہلے ایڈیشن میں ہمایوں نامہ، کلیلہ و دمنہ، قابوس نامہ، حکایات حکیم قانی، آشیان بلبل، محاورہ سیاح بایکے از وحشیان امریکائے شمالی اور مجادلہ درمیان علوم و فنون، پروانہ، ماہ و انجم بھی شامل نصاب کیے تھے۔ جن میں اکثر کا تعلق قدیم نثری علمی سرمائے سے

ہے۔ بعد کے ایڈیشنوں میں یہ سارا حصہ نصاب سے خارج کر دیا گیا تھا۔ (ایضاً، ص ۱۶۷، ۱۶۸)۔ اس لیے نصاب کی آخری شکل علامہ کے تصورات کی صرف جزئی نمائندگی کرتی ہے اور اس میں قدیم علمی و ادبی ورثے کی حفاظت کا تصور صرف اشعار ہی میں باقی رہ سکا ہے۔

۷

تعلیم کی اعلیٰ سطحوں کی بات کرتے ہوئے علامہ کے تصورات کے بارے میں دو پہلوؤں پر غور ضروری ہے: ایک تو یہ کہ قرآن حکیم سے (تعلیم کے حوالے سے) کیا بنیادی فکر ظاہر ہوتی ہے؟ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کی سماجی تاریخ میں مختلف علوم کی کیا اہمیت رہی ہے؟

اس حوالے سے سورہ آل عمران کی آیات ۹۰، ۹۱ پر غور کرنا ضروری ہے۔ علامہ اقبال نے ان آیات مبارکہ پر غور کیا اور بتایا کہ قرآن پاک نے انسان کے داخلی تجربے کو علم میں نمایاں جگہ دی ہے اور علم کو عمل کا پابند کیا۔ دوسرے، بعض آیات کریمہ میں علم کے ذرائع کی طرف بھی اشارہ ہے، یعنی مظاہر قدرت اور تاریخ کا مطالعہ۔ قرآن پاک، حقائق کے بارے میں مظاہر فطرت میں اشارات کی موجودگی کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ مسلمانوں کا یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ ان "نشانیوں" پر غور کریں اور ان مطالب کی مدد سے زندگی کی حقیقتوں میں پوشیدہ معانی کا مطالعہ کریں۔ مادی حقائق پر غور، مسلمانوں کے فکر کا لازمی عنصر ہے۔ تاریخ کی اہمیت یہ ہے کہ اس سے قوموں کے ماضی کے احوال معلوم ہوتے ہیں۔ ماضی کی مدد سے حال و مستقبل کو سنوارنے کا لائحہ عمل وضع کیا جا سکتا ہے۔ مطالعہ تاریخ سے حیات و کائنات کو کل کے طور پر دیکھنے کا شعور ملتا ہے اور انسان ادراک اشیا کے ذریعے روحانی و وجدانی حقائق تک رسائی پاتا ہے۔

مذہب کو مرکزی اہمیت حاصل ہے جس کے بغیر زندگی کا کوئی شعبہ بھی صحیح نتائج کے استخراج میں معاون نہیں ہو سکتا، کیونکہ مذہب کا تعلق زندگی کے مختلف شعبوں کے باہمی ربط سے ہے۔ مادی زندگی پوری حقیقت کی نمائندگی نہیں کرتی، نہ روحانی زندگی مادی زندگی سے الگ ہو کر حقائق کی شناخت کر سکتی ہے۔ اس لیے کائنات کے مادی پہلو بھی قابلِ

توجہ ہیں اور سائنسی علوم بھی اہم ہیں۔ سائنس حقائق اشیا تک رسائی کا ایک وسیلہ ہے۔ سائنس علم کی ایک قابل اعتماد شاخ ہے، اس سے حقائق کی خارجی طور پر تصدیق ممکن ہے۔ اس سے آئندہ کے بارے میں پیش گوئی ہو سکتی ہے اور واقعات پر کامل اختیار بھی مل سکتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ سائنس حقائق کی پہچان کا واحد ذریعہ نہیں۔ یہ حقیقت کا ایک حصہ ہے، پوری حقیقت نہیں۔ دوسرا حصہ مذہب سے حاصل ہوگا اور دونوں کے ملاپ سے حقیقت ایک کل کی صورت پاتی ہے۔

سائنسی علوم، سماجی علوم، ادبیات، فنون لطیفہ اور فلسفیانہ علوم، کوئی بھی قائم بالذات نہیں اور اکیلے اکیلے رموز حیات کا انکشاف نہیں کرتے، بلکہ جملہ علوم و فنون حقائق کی تہہ تک پہنچنے کے وہ مختلف راستے ہیں، جو سماجی زندگی کے تسلسل میں اپنا آپ ظاہر کرتے ہیں۔

قرآن پاک ہماری تعلیم کا بنیادی رکن ہے۔ مسلمانوں کی سماجی تاریخ کے دھارے میں نصاب تعلیم کو مرکزی اہمیت حاصل تھی۔ مکتبی تعلیم سے لے کر اعلیٰ درجات تک مطالعہ قرآن کی خاطر دیگر علوم کو ترقی ملی۔ علوم و فنون کی درجہ بندی بھی اس حوالے سے ہوئی۔ صرف و نحو، علم حدیث، علم فقہ، علم تجوید، علم تفسیر اور دوسرے علوم مفیدہ مثلاً ریاضی، الجبرا، جیومیٹری، فلکیات، کیمیا، سماجی علوم میں جغرافیہ، تاریخ، سوانح اور طب اسی مرکزی نقطے کے گرد گھومتے رہے۔ فنون لطیفہ میں خطاطی، مصوری، کوزہ گری اور فن تعمیر بھی قومی اور فوجی ضرورتوں کے تحت ترقی کرتے رہے۔ کھیلوں میں نیزہ بازی، شاہ سواری وغیرہ، فوجی ورزشیں بھی ضرورت کے تحت ترقی پاتی رہیں۔ صنعت اور فنون حرب بھی اسی مرکز سے متعلق رہے اور اس مذہبی نسبت سے حلال و حرام کے پابند ہوئے۔

تعلیم کا دائرہ تلاش خیر اور انسان کو انسان بنانے پر مبنی تھا۔ روحانی اور اخلاقی قدروں کا مرکزی درجہ تھا اور جس شاخ علم یا شاخ فن کی زد اخلاقی اقدار پر پڑتی تھی، وہ ترجیحات میں آخری سطح پر چلے جاتے تھے یا زیادہ منفی ہونے کی صورت میں انھیں بالکل ترک کر دیا جاتا تھا۔ سماجی ترقی کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے زندگی پیچیدہ ہوتی گئی، ان علوم کی تفصیلات بھی وضع ہوتی گئیں۔ خصوصاً جب عالم اسلام کو یونانی فلسفہ سے سابقہ پڑا، تصادم کی کیفیت رونما ہوئی۔ مسلمانوں نے اول یونانی فلسفے کو تمام و کمال ہضم کرنے کی کوشش کی، پھر امتزاجی

عمل کے ذریعے ردو قبول شروع ہوا۔ کچھ عرصے کے بعد یونانی فلسفے کے منفی پہلو رد ہو گئے۔ مابعد الطبیعیاتی مسائل اہم ہوئے تو منطق استقرائی اور منطق استخراجی سے کام لے کر یونانی افکار کی تردید علم کلام کے ذریعے کی گئی۔ یونانی افکار اور مسلمانوں کے افکار میں یہ کش مکش نئے علوم کی بعض نئی شاخوں کا باعث بنی۔ اسلامی افکار کی نئی تعبیر و تشریح ہوئی اور نظام تعلیم میں معقولات کو جگہ دی گئی، اس کی تہ میں اسلامی فکری وحدت برقرار رکھ کر یونانی علوم کے سیکولرزم کو ترک کر دیا گیا۔ تاویل، تشریح، امتزاج اور دفاع کی کئی شکلوں نے جنم لیا۔ اس عمل میں تعلیم کے انسانی پہلو ابھرے۔ آزادی فکر کی اس روش نے علوم و فنون کی ترقی کے لیے نئی راہ ہموار کی۔

عباسی خلفا کے دربار، علوم و فنون کی ترقی اور دنیا داری کی مقبولیت کے مراکز تھے۔ عباسی دور ہی میں علوم و فنون کے دینی رشتے کسی قدر کمزور پڑتے گئے تھے۔ اسلام میں موسیقی ریاضی کی شاخ تھی، اب عیش و عشرت سے منسوب ہوئی۔ علوم کو اکائی ماننے کی وجہ سے علوم و فنون کے باہمی رشتے نئی نئی تعبیروں کا سبب ہوئے۔ طب، علم الابدان اور نفسیات سے متعلق ہوئی۔ علم کلام نے فلسفہ، منطق اور مذہب کے امتزاج سے نئی شکل اختیار کی۔ مصوری نے جیومیٹری اور گل کاری سے رشتہ جوڑا۔ فن تعمیر نے مساحت سے چل کر جمالیات سے ناتا استوار کیا۔ غرض امتزاجی رویے نے سماجی علوم، سائنسی علوم، ادب اور فنون لطیفہ سب میں وحدت کا وجود کسی حد تک برقرار رکھا۔ درباری عیش و عشرت کی وجہ سے آخر میں یہ دینی رشتہ کم ہوتا گیا تو دنیا داری نے قبضہ جمانا شروع کیا۔

منگولوں کے حملے (۱۲۵۸ء) کے بعد عالم اسلام میں منفی رجحانات شدت سے ابھرے۔ سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا، فکر و نظر کے چشمے سوکھ گئے۔ اس زوال نے علم کی وحدت کو بھی نقصان پہنچایا۔ اصل حقائق کی جگہ فلسفے کی موشگافیاں بڑھ گئیں۔ دین آہستہ آہستہ عام معاشرتی زندگی سے غائب ہوتا گیا۔ نصاب میں بھی دینی کتب کے اصل متن کم ہوئے، قرآن کی جگہ تربیتی طرز کی کتابوں نے لے لی۔ دین، صوفیا کی محفلوں اور مساجد میں سمٹ کر رہ گیا۔ صوفیا کے حلقوں سے بھی دنیا خارج رہی۔ ترک دنیا، قناعت اور تقدیر پرستی پر زور ہوا، ظاہر و باطن الگ ہو گئے۔ اس حالت میں برصغیر میں جو نصاب تعلیم رائج ہوا، اس میں دینی علوم کی بجائے زبان و بیان پر زیادہ زور صرف ہوا۔

وقت کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی، ہر دو زبانیں مقامی باشندوں کے لیے بدیسی بنتی گئیں، اس لیے زبان کی تدریس میں گرائمر زیادہ اہم ہوئی۔ درسی کتابوں میں زمانہ ماضی کے اصل اور فرضی مسائل اور معاملات تھے جن کا رشتہ معاصر زندگی سے نہ تھا۔

اکبری الحاد کے خلاف مذہب نے اپنا دفاع کیا تو اس بنا پر علم حدیث اور سیرت کو تقویت ملی، لیکن نصاب کا غالب حصہ پھر بھی منطق اور فلسفے پر مشتمل تھا۔ نصاب میں دینی کتب صرف تین رہ گئی تھیں، تفسیروں میں بھی دو ڈھائی پارے نصاب کا حصہ تھے۔ اٹھارھویں صدی میں ملا نظام الدین اور شاہ ولی اللہ کے گھرانے نے دینی ادارے قائم کر کے تعلیم میں کچھ تبدیلی کی۔ درس نظامیہ کی تدریس کا آغاز ہوا تو اس میں بھی زیادہ زور مابعد الطبیعیاتی مسائل پر تھا۔ شاہ ولی اللہ کے خانوادے نے البتہ معاشرتی زندگی سے تعلق رکھنے کی کوشش کی لیکن نظام تعلیم میں یہ تبدیلی زیادہ دور تک نہ جا سکی۔

اس پس منظر میں تعلیم میں درجہ بندی کچھ اس طرح تھی:

الف۔ قرآن اور حدیث کی حیثیت مرکزی تھی۔

ب۔ دوسرے نمبر پر تاریخ، سائنس اور جملہ سماجی علوم تھے۔

ج۔ علوم میں مزید درجہ بندیاں فوجی اور سیاسی ضرورتوں کے تحت ہوئیں۔ مارشل علوم کی ترقی زیادہ ہوئی۔ فنون لطیفہ میں صرف وہ علوم زیادہ اہم رہے جو کسی نہ کسی طرح مذہب یا فوجی ضرورتوں سے مربوط تھے۔ اسی لیے بت تراشی کی سب سے کم اہمیت تھی، کیونکہ نہ اس کی کوئی افادی حیثیت تھی، نہ مذہبی، نہ سماجی۔

۸

عصر حاضر میں سائنس نے بہت اہمیت پائی ہے۔ کوئی ملک بھی دفاعی ضرورتوں سے غافل نہیں ہو سکتا، تاہم ساری قوم کو سائنس دان بنانے کی مہم غیر فطری ہے۔ پاکستان پس ماندہ ممالک میں شامل ہے۔ اس کے مالی وسائل محدود ہیں، اس لیے وہ سائنس کی دوڑ میں ان ملکوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا جو مالی طور پر مستحکم ہیں۔ ہمیں سوچنا پڑے گا کہ ہماری ضرورت کے اعتبار سے کتنی افرادی قوت ہمیں اس محاذ کے لیے تیار کرنی ہے۔ اپنی

ضرورتوں کی منصوبہ بندی کر کے سائنس سیکٹر کو کسی حد تک محدود کرنا پڑے گا۔ اسی طرح مخصوص نصب العین کی مدد سے جملہ علوم کو ایک وحدت میں پرو کر ہمیں اپنا تشخص علوم کے حوالے سے برقرار رکھنا ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ ادب "تلاش روزگار" میں زیادہ مفید نہیں اور ہماری ترجیحات میں اس کا گراف بہت نیچے چلا گیا ہے، لیکن ادب اور سماجی علوم نے بالواسطہ طور پر ماضی میں کردار سازی کا فریضہ ادا کیا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے۔ چند نکات غور طلب ہیں:

۱۔ سارے علوم و فنون دینیات نہیں بنائے جا سکتے اور نہ عالم اسلام میں یہ کبھی ہوا ہے۔ اسلامیات کا تحقیقی مطالعہ ماہرین کا کام ہے یا پھر اسلامیات کے نصاب ہی میں اس کی اساسی اہمیت ہو سکتی ہے۔ باقی علوم و فنون، دینی رجحان کے تابع البتہ رہیں گے۔

۲۔ خود اسلامیات کا موجودہ نصاب نظر ثانی چاہتا ہے۔ اس میں قرآنی متن کو مرکزی اہمیت حاصل ہونی چاہیے، جو اس وقت نہیں۔ اسلامیات میں علوم قرآنیہ کو زیادہ جگہ دینی ہو گی، اور عربی زبان بھی اس مضمون کے طالب علموں کے لیے لازم قرار پائے گی، یا شعبہ عربی اور اسلامیات کو ایک شعبہ بنانا ہوگا۔

۳۔ زبانوں کی تدریس میں بھی یہ خیال رکھنا ہو گا کہ ہمارے دو مقصد ہیں: ایک جدید زبانوں سے آشنائی اور دوسرے قدیم ورثے کی بازیافت۔ یہاں بھی عربی اور فارسی کی اہمیت کو یقیناً دوسری زبانوں پر فوقیت دینی پڑے گی، اور ان کے نصابات کو قومی اور ملی ضرورتوں کے مطابق دوبارہ تشکیل دینا ہوگا۔

۴۔ پورے نظام تعلیم میں مختلف مضامین کی درجہ بندی لازم ہے، لیکن اس اضافے کے ساتھ کہ نہ سارے مضامین کو دینیات بنایا جا سکتا ہے نہ مختلف زبانوں پر اتنا اصرار ہو سکتا ہے کہ طالب علم محض زبانوں کی تدریس میں اپنے آپ کو ختم کر دیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ سائنس کو ڈنڈے کے زور سے نافذ کرنا ممکن نہیں۔ ہم نے محض سائنس پر زور دے کر تربیت اور اخلاقیات کو معاشرے سے نکال دیا ہے، جس سے نفع پسندی کے غیر معمولی رجحانات نمودار ہوئے ہیں اور معاشرتی زندگی آج انتشار کا شکار ہے۔

۵۔ توازن کا وہ اسلامی اصول برقرار اور بحال کرنا ہو گا جسے ہم نے مغرب پرستی میں خیرباد

کہہ دیا تھا۔ اس کے بغیر معاشرتی زندگی میں ثبات ممکن نہیں۔

۹

علامہ اقبال کی رائے میں تاریخ، قوموں کا ذہن ہوتی ہے۔ اگر کوئی قوم اپنا حافظہ بھلا دے تو وہ مردہ ہو جاتی ہے۔ اس لیے میرے خیال میں کالج کی سطح پر (کم از کم ایف اے تک) تاریخ کو لازمی مضمون کی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔

تاریخ کی اہمیت علامہ نے مثنوی اسرار و رموز میں کھل کر بیان کی ہے اور اسے مسلمانوں کے جملہ علوم میں سب سے زیادہ ضروری قرار دیا ہے۔ ان کی رائے میں حال کا ماضی سے گہرا رشتہ ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل ایک وحدت ہیں۔ حیات لازوال کا حصول ماضی، حال اور مستقبل کو یکجا کر کے ہی ممکن ہے۔ زندگی میں ماضی کے تجربات کی تکرار نہیں ہوتی لیکن خود آگاہی کے لیے ضروری ہے کہ انسان ماضی کے شعور سے فائدہ اٹھائے۔ یہی تاریخ کے مضمون کا مدعا ہے۔

علامہ نے انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں اس بات پر خاص طور پر زور دیا کہ تاریخ کا مطالعہ مسلمان طالب علموں کے لیے لازمی ہو۔ ان کا مطالبہ یہ بھی تھا کہ انجمن حمایت اسلام تاریخ کے لیے اعلیٰ سطح کی ریسرچ کا ادارہ بھی قائم کرے۔

۱۹۳۲ء میں علامہ نے اسی مضمون کی خاطر نصابی جھگڑے میں بھرپور شرکت کی۔ پروفیسر جے ایف بروس تاریخ کے استاد بنے تو انھوں نے پنجاب یونیورسٹی کی ہندو اکثریت کے پیش نظر سینٹ میں یہ تجویز پیش کی کہ تاریخ اسلام بی اے پاس کورس سے خارج کر دی جائے۔ یہ تجویز ایک ووٹ سے منظور بھی ہو گئی۔ مسلمانان پنجاب نے مزاحمت کے لیے کئی جلسے کیے۔

علامہ اقبال نے ۱۱ جون ۱۹۳۲ء کو موچی دروازے کے باہر جلسے کی صدارت کرتے ہوئے یہ بتایا کہ غالباً ۱۹۲۳ء کو تاریخ اسلام، بی اے کے نصاب میں شامل کی گئی۔ ان کی یہ رائے صحیح ہے کہ ۱۹۲۳ء میں یونیورسٹی نے اس مضمون کا فیصلہ کیا، لیکن ہر فیصلہ چونکہ دو سال بعد امتحان کا حصہ بنتا ہے، اس لیے ۱۹۲۵ء کے امتحان کے لیے یہ مضمون داخل نصاب

ہوا تھا۔ (پنجاب یونیورسٹی کیلنڈر، ۱۹۲۵ء، ص ۳۲۴)

اس سے پہلے تاریخ اسلام، نصاب کا حصہ نہ تھی۔ ۱۹۲۲ء میں بی اے پاس کورس میں تاریخ ہند کا پہلا پرچہ تو لازمی تھا، دوسرے پرچے میں تین مضمونوں میں سے ایک لیا جاسکتا تھا: تاریخ انگلستان، تاریخ یورپ یا تاریخ یونان وروما میں سے ایک دور۔ اسی طرح آنرز میں پہلا پرچہ تاریخ ہند کا ابتدائی دور، لازمی تھا۔ دوسرے پرچے میں سیاسیات یا تاریخ یا جغرافیہ میں سے ایک لیا جاسکتا تھا۔ (ایضاً، ۱۹۲۲ء، ص ۱۷۲)

یہی صورت کم و بیش اگلے برسوں میں بھی تھی، اس فرق کے ساتھ کہ کبھی پاس کورس کے دوسرے پرچے میں صرف تاریخ یونان، کبھی تاریخ روم ادل بدل کر رکھے جاتے تھے۔ (یونیورسٹی کیلنڈر ۱۹۲۲-۲۴، ص ۳۱۳) اسی طرح آنرز میں جغرافیے کا کوئی سا موضوع لازمی تھا (ایضاً، ص ۳۱۵)۔ ۱۹۲۵ء میں جب تاریخ اسلام داخل نصاب ہوئی تو اس کا عنوان تھا "تاریخ اسلام کا عمومی خاکہ" اس میں رسول پاک ﷺ کے زمانے سے لے کر خلفائے عباسی کے دور عروج تک کا زمانہ شامل تھا۔ دوسرے پاس کورس میں دوسرے پرچے کا آپشنل، تاریخ انگلستان یا تاریخ یورپ یا تاریخ روم یا تاریخ یونان نصاب کا حصہ قرار پائے تھے۔ (ایضاً، ص ۳۲۴)

یہ صورت حال دو لحاظ سے غور طلب ہے: ایک تو یہ کہ تاریخ اسلام چار مضامین کے آپشنل حصے میں تھی، یعنی تاریخ کے طالب علم چار حصوں میں بٹ جاتے تھے۔ اس طرح طلبہ کی تھوڑی تعداد تاریخ اسلام پڑھتی ہو گی یعنی مسلمان بھی سارے یہ مضمون نہ لیتے ہوں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت اس کے برعکس ہو گئی تھی۔ ۱۹۳۲ء تک یہ آپشن سب سے زیادہ مقبول ہو گئی ہو گی اور باقی ملکوں کی تواریخ پس منظر میں چلی گئیں، ورنہ پاس کورس کے نصاب سے خارج کرنے کا کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔ علامہ اقبال نے بھی پاس کورس میں طلبا کی زیادہ تعداد کے تاریخ اسلام لینے کا تذکرہ کیا ہے اور اسی کو خارج کرنے کا سبب قرار دیا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ "عقل انسانی جب شرارت پر آجائے تو وہ اپنے اندرونی جذبات و محرکات سے کام لے کر اپنے مقصد کی تکمیل پر متوجہ ہو جاتی ہے"۔ (گفتار اقبال، ص ۱۵۳)

دوسری بات یہ ہے کہ غالباً پروفیسر بروس کو اسلام کا ابتدائی دور کھٹک رہا تھا اور عباسی دور یا منگولوں کے بعد کا دور اس لحاظ سے بے ضرر تھا کہ اس سے مسلمانوں کا سیکولر

اسلوب حیات ظاہر ہو رہا تھا۔ ایم اے کے پرچے کو گوارا کرنے کا شاید یہی سبب تھا۔

مسٹر بروس کی رپورٹ پر علامہ نے مفصل بحث کی ہے۔ بقول علامہ، بروس کا استدلال یہ ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کو ہندوستان کی تاریخ پڑھنی چاہیے۔ (ایضاً، ص ۱۵۷)۔ علامہ کا اعتراض اس حوالے سے نامکمل ہے کہ انھوں نے اس بات کو پیش نظر نہیں رکھا کہ پروفیسر بروس برطانوی دور کی تاریخ ہند کے مخالف نہیں تھے۔ ہندوستان کی تاریخ داخل نصاب تھی اور لازمی پرچہ تھی۔ دوسرے پرچے میں تاریخ برطانیہ، تاریخ یورپ اور تاریخ روم بھی شامل تھیں اور ایک عرصے سے پڑھائی جا رہی تھیں۔ اس لیے ہندوستان کے لوگ تاریخ ہندوستان کے علاوہ پاس کورس میں دوسرے ملکوں کی تاریخ بھی پڑھ رہے تھے، حتیٰ کہ آنرز میں بھی برطانیہ کی آئینی تاریخ، برطانیہ کی سیاسی تاریخ، تاریخ یورپ اور تاریخ دنیا بدستور داخل نصاب تھیں اور ہمیشہ رہیں۔ اس لیے پروفیسر بروس کے استدلال کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ پروفیسر بروس جھوٹ سے کام لے رہے تھے۔

علامہ اقبال نے پروفیسر بروس کے اس دعوے کو غلط قرار دیا ہے کہ "ہندوستان کے لوگوں کو صرف تاریخ ہند پڑھنی چاہیے" ان کے بیان کے مطابق: "یہ دعویٰ غلط ہے کہ کسی قوم کی تاریخ کو اس قوم کی تاریخ نہ سمجھا جائے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ، اجتماعی حیثیت سے انسانی روح کی ایک حرکت ہے، روح انسانی کا کوئی ماحول نہیں بلکہ تمام عالم اس کا ماحول ہے، اگر اسے کسی قوم کی ملکیت سمجھا جائے تو یہ تنگ نظری کا ثبوت ہے"۔ (ایضاً، ص ۱۵۴)

علامہ کا استدلال شاید اس بنا پر یہ ہے کہ قرآن میں دیگر اقوام کے حالات بھی بیان ہوئے اور ان کے عروج و زوال کا پس منظر بیان کیا گیا ہے۔ علامہ غالباً تاریخ اسلام ہی نہیں دیگر ممالک کی تاریخ بھی پڑھانے کے قائل تھے، لیکن ان کے ہاں اولین حیثیت تاریخ اسلام ہی کو حاصل تھی۔

مسلمانان ہند کی مخالفت کے نتیجے میں تاریخ اسلام، بی اے پاس کورس کے پرچے میں بدستور آپشنل رہی، بلکہ یونیورسٹی کیلنڈر ۱۹۲۸ء - ۲۹ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنرز کے نصاب میں بھی تاریخ اسلام شامل تھی، یعنی ۱۹۲۵ء ہی سے ایم اے کے نصاب میں ایک آپشنل پرچہ عباسی دور کی اسلامی تاریخ بھی تھا۔

ایک بات اور غور طلب ہے کہ اسلامی تاریخ کے لیے صرف وہ نصابی کتب داخل

نصاب تھیں جو مستشرقین نے لکھیں اور جن کی مخالفت علامہ نے ہمیشہ اس بنا پر کی تھی کہ مستشرقین اپنی مرضی کے نتائج نکالتے ہیں۔

علامہ نے یہ کوشش بھی کی کہ مسلمان اپنے طور پر تاریخ میں اعلیٰ تحقیق کے لیے اپنے ادارے قائم کریں۔ انجمن حمایت اسلام کے علاوہ علامہ دوسری قدیم و جدید درس گاہوں میں بھی تاریخ اسلام کو شامل نصاب کر کے اسے مسلمانوں کی تعلیم کا ضروری حصہ بنانا چاہتے تھے، چنانچہ مسلم انسٹی ٹیوٹ کے اسی جلسہ میں انھوں نے مشورہ دیا:

اسلامی ممالک کی مجموعی آبادی ہندوستان کے مسلمانوں کے قریباً مساوی ہو گی۔ پھر کیا یہ ضروری نہیں کہ ہم اس شعبے کی تدوین و تحقیق اور ترتیب و تنظیم پر متوجہ ہوں۔ انجمن حمایت اسلام کو چاہیے کہ ایسے ادارے کا افتتاح کرے، جہاں تاریخ اسلامی کی تعلیم کا بہترین بندوبست ہو۔ لیکن انجمن تنہا اس کام کو انجام نہ دے سکے گی، بلکہ آپ لوگوں کی امداد کی ضرورت ہے۔ کچھ عرصے سے انجمن مسلمانوں کے مفاد سے غافل اور ان کے جذبات سے ناآشنا ہے اور بعض غرض مند ہاتھوں میں ایک کھلونا بنی ہوئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آزاد طبع اصحاب کو خدمت کا موقع دیا جائے تاکہ کسی کو کوئی شکایت نہ رہے، (گفتار اقبال، ص ۱۵۴)۔

اسی اجلاس میں متفقہ طور پر قرارداد منظور کی گئی جو یہ تھی:

مسلمانانِ لاہور کا یہ جلسہ ہندوستان کی تمام جدید و قدیم اسلامی درس گاہوں، مثلاً مدرسہ عالیہ دیوبند اور سہارن پور و لکھنؤ وغیرہ کو تاریخ اسلامی کی تعلیم و ترویج کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مروجہ نصاب میں ترمیم کی جائے اور تاریخ اسلامی کو مسلمانوں کی تعلیم کا جزو لاینفک قرار دیا جائے۔ (گفتار اقبال، ص ۱۵۴)

علامہ اقبال الگ اسلامی یونیورسٹی کا تصور بھی پیش کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

ہندوستان میں اسلامی یونیورسٹی کا قائم ہونا ایک اور لحاظ سے بھی نہایت ضروری ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ہماری قوم کے عوام کی اخلاقی تربیت کا کام ایسے علما اور واعظ انجام دے رہے ہیں، جو اس خدمت کی انجام دہی کے پوری طرح سے اہل نہیں ہیں، اس لیے کہ ان کا مبلغ علم اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم کے متعلق نہایت ہی محدود ہے۔ اخلاق اور مذہب کے اصول و فروع کی تلقین کے لیے موجودہ زمانے کے واعظ کو

تاریخ، اقتصادیات اور عمرانیات کے حقائق عظیمہ سے آشنا ہونے کے علاوہ اپنی قوم کے لٹریچر اور تخیل میں پوری دسترس رکھنی چاہیے۔ الندوہ، علی گڑھ کالج، مدرسہ دیوبند اور اس قسم کے دوسرے مدارس جو الگ الگ کام کر رہے ہیں، اس بڑی ضرورت کو رفع نہیں کر سکتے، ان تمام بکھری ہوئی تعلیمی قوتوں کا شیرازہ بند ایک وسیع تر اغراض کا مرکزی دار العلم ہونا چاہیے جہاں افراد قوم، نہ صرف خاص قابلیتوں کو نشوونما دینے کا موقع حاصل کر سکیں بلکہ تہذیب کا وہ اسلوب یا سانچہ تیار کیا جا سکے جس میں زمانہ موجودہ کے ہندوستانی مسلمانوں کو ڈھالنا چاہیے۔ پس یہ امر قطعی طور پر ضروری ہے کہ ایک نیا مثالی دار العلم قائم کیا جائے جس کی مسند نشین اسلامی تہذیب ہو اور جس میں قدیم و جدید کی آمیزش عجب دل کش انداز سے ہوئی ہو۔ اس قسم کی تصویر مثالی کھینچنا آسان کام نہیں ہے، اس کے لیے اعلیٰ تخیل، زمانے کے رجحانات کا لطیف احساس اور مسلمانوں کی تاریخ اور مذہب کے مفہوم کی صحیح تعبیر لازمی ہے۔

(مقالات اقبال، ص ۱۳۵-۱۳۶)

اسی طرح علامہ نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اسلامی تعلیم کے خصوصی نصاب پر بحث کرتے ہوئے اہم مشورے دیے، خاص طور پر قدیم طرز کے مدرسوں کے طالب علموں کو علوم جدیدہ سے واقف کرنے کے لیے ان کی تجاویز بہت اہم ہیں، فرماتے ہیں:

مجھے اندیشہ ہے کہ میں آپ کے مسلم دینیات کے مجوزہ نصاب سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ میرے نزدیک قدیم طرز پر مسلم دینیات کا شعبہ قائم کرنا بالکل بے سود ہے۔ اگر اس سے آپ کا یہ مقصد نہیں ہے کہ سوسائٹی کی زیادہ قدامت پسند جماعت کی تالیف قلب مد نظر رہے۔ جہاں تک روحانیت کا تعلق ہے، کہا جا سکتا ہے کہ قدیم تر دینیات فرسودہ خیالات کی حامل ہے اور جہاں تک تعلیمی حیثیت کا تعلق ہے جدید مسائل کے طلوع اور قدیم مسائل کی طرح نو کے مقابلے میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ---(ایضاً ص ۲۱۵) میں آپ کی اس تجویز سے پورے طور پر متفق ہوں کہ دیوبند اور لکھنؤ کے بہترین مواد کو بر سر کار لانے کی کوئی سبیل نکالی جائے۔ مگر سوال یہ ہے کہ آپ ان لوگوں کو انٹرمیڈیٹ تک تعلیم دینے کے بعد کیا کریں گے؟ کیا آپ ان کو بی اے اور ایم اے بنائیں گے؟ (ایضاً ۲۱۷)--- میں یہاں ایک بات

اور عرض کرنا چاہتا ہوں، آپ کو ندوہ اور دیوبند کے لوگوں کو انٹرمیڈیٹ کے معیار تک پہنچانا ہے، میں چاہتا ہوں کہ وہ یونیورسٹی کے انٹرمیڈیٹ امتحان پاس کرنے پر مجبور کیے جائیں۔ یہاں وہ سوائے انگریزی کے کوئی دوسری زبان اختیار نہ کر سکیں گے، دوسرے مضامین میں وہ حسب ذیل مضامین سے انتخاب کر سکیں گے۔
(الف) علوم طبیعی (ب) ریاضیات (ج) فلسفہ (د) اقتصادیات

(مقالات اقبال، ص ۲۲۴)

علامہ کی یہ تجاویز دینی مدارس کے تعلیم یافتہ حضرات کو جدید علوم سے آشنا کرنے کے لیے تھیں جو تکمیل تک نہ پہنچ پائیں اور آخر انھوں نے چودھری نیاز علی کی تجویز پر پٹھان کوٹ میں ایک ادارہ قائم کرنے سے اتفاق کیا، تاکہ فقہ اسلامی کی تدوین نو ممکن ہو جائے۔ علامہ جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ پیشہ ورانہ تعلیمی اداروں کی ضرورت کا بھی احساس رکھتے تھے، خاص طور پر ان کے سامنے جاپان کی مثال تھی، جہاں صنعتی تعلیم انقلاب برپا کر رہی تھی۔ وہ مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے اسی قسم کی تعلیم پر زور دیتے ہیں۔

۱۰

عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ علامہ عورتوں کی تعلیم اور حقوق کے سلسلے میں تنگ نظر تھے۔ اس کی تردید علامہ کی وہ تقریر کرتی ہے جو انھوں نے مسلم خواتین کے سپاس نامے کے جواب میں کی تھی۔ اس سے کئی برس پہلے انھوں نے حقوق نسواں، پردے کا مسئلہ، تعدد ازدواج اور عورتوں کی تعلیم پر خاص طور پر زور دیا تھا۔

عورتوں کے بارے میں علامہ کے جو اشعار اردو میں ملتے ہیں، ان سے حقوق نسواں کی یک طرفہ تصویر بنتی ہے، جو حقیقت پر مبنی نہیں۔ اس کے ساتھ علامہ کے فارسی کلام اور اردو، انگریزی نثر کو بھی دیکھنا ضروری ہے۔

آزادی نسواں کو علامہ یورپ کی طرح "مادر پدر آزادی" بنانا نہیں چاہتے۔ ان کی رائے میں عورت کے لیے اخلاقی پابندیوں کا برقرار رہنا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ اصلاح تمدن اور تعلیم عام کی ضرورت پر انھوں نے ہمیشہ زور دیا اور زندگی میں انقلاب آجانے کی

وجہ سے بعض تمدنی ضرورتوں کو اہم قرار دے کر شریعت اسلامی کے ان حصوں کو حذف کرنے پر زور دیا جو قدیم تمدنی زندگی کی وجہ سے مسلمانوں میں در آئے تھے۔ ان کی رائے میں:

مسلمات مذہب میں کوئی اندرونی نقص نہیں ہے، بلکہ قرآن شریف اور حدیث کے وسیع اصول کی بنا پر جو استدلال فقہا نے وقتاً فوقتاً کیا، ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو خاص خاص زمانوں کے لیے واقعی مناسب اور قابل عمل ہیں مگر حال کی ضروریات پر کافی طور پر حاوی نہیں ہیں۔ (مقالات اقبال، ص ۲۲۳)

عورتوں کی تعلیم کے لیے ان کا آئیڈیل حضرت فاطمۃ الزہرا ہیں۔ علامہ کی رائے میں، "کامل عورت بننا ہو تو آپ کو حضرت فاطمۃ الزہرا کی زندگی پر غور کرنا چاہیے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی سعی کرنی چاہیے"۔ (گفتار اقبال، ص ۸۳، مقالہ "شریعت اسلام، مرد اور عورت کا رتبہ" ۷ جنوری سنہ ۱۹۲۹ء کو انجمن خواتین اسلام کے سپاس نامہ کے جواب میں)

مذکورہ بالا خطبے میں حقوق نسواں پر بہت زور دیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ "اسلام مرد و زن میں قطعی مساوات کا قائل ہے، آیات قرآنی میں جہاں علما نے مرد کی فوقیت کا نتیجہ نکالا ہے، علامہ اقبال اسے تسلیم نہیں کرتے۔ ان کی رائے ہے کہ "عربی محاورے کی رو سے اس کی یہ تعبیر صحیح معلوم نہیں ہوتی کہ مرد کو عورت پر فوقیت حاصل ہے۔ عربی گرائمر کی رو سے قائم کا صلہ جب علیٰ پر آئے گا معنی محافظت ہو جاتے ہیں" (گفتار اقبال، ص ۷۶)

مرد عورت کا "محافظ" ہے لیکن "کئی لحاظ سے مرد و عورت میں کسی قسم کا فرق نہیں"۔

علامہ نے اسلام کی ابتدائی تاریخ سے مثالیں دی ہیں کہ کس طرح عورتوں نے جہاد میں حصہ لیا حضرت عائشہ دینی درس دیتی تھیں۔ خلفائے عباسیہ کے دور میں ایک موقع پر خلیفہ کی بہن قاضی القضاۃ مقرر ہوئیں اور فتویٰ صادر کرتی رہیں۔ علامہ عورتوں کو ووٹ کا حق دینے کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کے لیے "خلافت اسلامیہ میں خلیفہ کے انتخاب پر ہر شخص کو رائے دینے" کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ ضروری شرط انھوں نے ہر جگہ بیان کی ہے کہ اسلامی معاملات میں اعتدال مد نظر رکھنا ضروری ہے۔ ہاں البتہ ان کی رائے میں تمدنی لحاظ سے مردوں اور عورتوں کے فرائض مختلف ہیں۔ فرماتے ہیں:

یہ فرائض بعض تو خدائی احکام کی رو سے ہیں اور بعض خود وضع کردہ ہیں، بعض فطری

طور پر ہیں۔ عورت کے بحیثیت عورت اور مرد کے بحیثیت مرد بعض خاص علاحدہ علاحدہ فرائض ہیں۔ ان فرائض میں اختلاف ہے مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ عورت ادنیٰ ہے اور مرد اعلیٰ۔ فرائض کا اختلاف اور وجوہ پر مبنی ہے گو تمدنی ضروریات کی وجہ سے فرائض میں اختلاف ہے۔ مدنی زندگی کے لیے جو احکام ہوں گے وہ فرائض کو مد نظر رکھ کر ہوں گے۔ (گفتار اقبال، ص ۷۶-۷۷)

امت مسلمہ میں عورت کی تعلیم اس لیے ضروری ہے کہ مرد کی تعلیم فرد واحد کی تعلیم ہے اور عورت کی تعلیم پورے معاشرے کی تعلیم ہے۔ علامہ، عورت کے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے حامی ہیں لیکن فرائض کی علاحدگی کی وجہ سے عورتوں اور مردوں کی تعلیم الگ الگ اور مضامین کی درجہ بندی مختلف چاہتے ہیں۔ عورتوں کی تعلیم کے لیے علامہ نے جداگانہ نصاب کی ضرورت پر بھی زور دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

قومی ہستی کی مسلسل بقا کے لیے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ ہم اپنی عورتوں کو ابتدا میں ٹھیٹ مذہبی تعلیم دیں۔ جب وہ مذہبی تعلیم سے فارغ ہو چکیں تو انھیں اسلامی تاریخ، علم تدبیر خانہ داری اور علم اصول حفظ صحت پڑھایا جائے۔

(مقالات اقبال، ص ۱۳۸)

علامہ کی نظر میں عورت کا اولین فرض اولاد کی تربیت ہے، اس لیے "امومت" کے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دینے کے لیے، اور گھر بار کی دیکھ بھال کے لیے وہ عورتوں کی تعلیم کا خاص اہتمام چاہتے ہیں۔ اس نصاب تعلیم میں بقول علامہ "وہ مضامین جو ان کی نسائیت کی نفی کرنے یا اسلام کی حلقہ بگوشی سے انھیں آزاد کرانے والے ہیں، بہ احتیاط ان کے نصاب تعلیم سے خارج کر دینے چاہئیں"۔ (ایضاً، ص ۱۳۸)

مسلمان لڑکیوں کے تعلیمی نصاب میں وہ جغرافیے کو بھی ضروری قرار دیتے ہیں، فرماتے ہیں: "...... لڑکیوں کے لیے جو اسلامیہ سکول اس وقت وجود میں ہیں یا آئندہ بنائے جائیں ان میں ..... جغرافیے کی ترویج نہایت ضروری ہے۔

(اقبال نامہ ج ۱، ص ۲۶۲، مکتوب مورخہ ۱۱ اپریل ۱۹۱۳ء)

ان نصابی ضرورتوں کو سامنے رکھتے ہوئے وہ الگ یونیورسٹی کے قیام کی تجویز بھی پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے انجمن حمایت اسلام کا صدر منتخب ہونے پر ایک مفصل بیان

دیا۔ فرماتے ہیں:

دوسرا امر جو آپ کی فوری توجہ کا محتاج ہے، وہ مسلمان لڑکیوں کی تعلیم ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ مسلمانوں کا متوسط طبقہ اب کافی بیدار ہو چکا ہے اور اس بات کا مطالبہ کر رہا ہے کہ ان کی اولاد کی صحیح اسلامی اصول کے مطابق تعلیم و تربیت کی جائے۔ میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ انجمن حمایت اسلام فی الحال مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کے لیے اپنا نصاب تجویز کرے، اور مجوزہ نصاب کے مطابق ان کا سالانہ امتحان لے کر خود ہی سندات تقسیم کرے۔ جہاں تک لڑکیوں کی تعلیم کا تعلق ہے، فی الحال آپ صرف ایک امتحان لینے والے ادارے کے طور پر کام شروع کر دیں اور رفتہ رفتہ اس ادارے کو مسلمان عورتوں کی ایک آزاد یونیورسٹی کی صورت میں منتقل کر دیں بلکہ آپ کا مجوزہ انڈسٹریل گرلز سکول بھی اسی یونیورسٹی کی ایک شاخ قرار پائے۔

(مقالات اقبال، ص ۲۱۴)

۱۱

درس و تدریس میں ذریعہ تعلیم کا مسئلہ بھی علامہ کی توجہ کا مرکز رہا۔ اس موضوع کے ذریعے ہم علامہ کے تصورات کے آخری حصے پر آجاتے ہیں۔

زبان کے بارے میں علامہ کا موقف بہت واضح تھا۔ فرماتے ہیں:

زبان کو میں ایک بت تصور نہیں کرتا جس کی پرستش کی جائے، بلکہ اظہار مطالب کا ایک انسانی ذریعہ خیال کرتا ہوں۔ زندہ زبان انسانی خیالات کے انقلاب کے ساتھ بدلتی رہتی ہے اور جب اس میں انقلاب کی صلاحیت نہیں رہتی تو مردہ ہو جاتی ہے۔

(اقبال نامہ، ج ۱، ص ۵۶، مکتوب ۱۹ اگست ۱۹۲۳ء)

بابائے اردو مولوی عبدالحق کے نام ۹ ستمبر ۱۹۳۷ء کو فرماتے ہیں:

اردو زبان کے تحفظ کے لیے جو کوششیں آپ کر رہے ہیں، ان کے لیے مسلمانوں کی آئندہ نسلیں آپ کی شکر گزار ہوں گی۔ (اقبال نامہ، ج ۲، ص ۸۵)

۲۷ ستمبر ۱۹۳۷ء کو انہی کے نام لکھتے ہیں:

یقین جانیے کہ اس اہم معاملے (اردو) میں، کلیتہً آپ کے ساتھ ہوں۔ اگرچہ میں اردو زبان کی بہ حیثیت زبان خدمت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا تاہم میری لسانی عصبیت، دینی عصبیت سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ (ایضاً، ج ۲، ص ۷۸-۷۹)

اردو زبان مسلمانوں کے ملی تشخص اور سیاسی نصب العین کا لازمی جز بن کر ابھری تھی، اس لیے علامہ اس کی حمایت میں اس شدت کے ساتھ کمربستہ رہے۔ انھوں نے اس معاملے کو ایک حیاتیاتی عنصر (biological factor) کے طور پر اختیار کیا۔ وہ اسے "عصبیت" کے نام سے یاد کرتے ہیں اور "اظہار کا وسیلہ" قرار دیتے ہیں۔ مسلمانوں کی سماجی تاریخ کے حوالے سے یہ حقیقت واضح ہے کہ عربی مسلمانوں کے لیے مذہبی زبان کے طور پر اہمیت رکھتی ہے، تمدنی سطح پر فارسی نے ثقافتی عمل کی تشکیل میں نمایاں حصہ لیا۔ قرون وسطیٰ میں عالم اسلام کی سرکاری اور درباری زبان فارسی ہی تھی۔ اسے ثقافتی سطح پر برتری مل چکی تھی۔ عربی کو پہلا اور فارسی کو دوسرا درجہ ملا تھا۔ مسلمان جس جس ملک میں گئے وہاں کی مقامی زبان کو انھوں نے تیسرا درجہ دیا۔ تبلیغی سرگرمیوں میں مقامی بولیاں بھی کام آئیں۔ چوتھے نمبر پر انھیں جگہ دی گئی۔ سماجی قوتوں کے عمل میں زبانوں کی یہ درجہ بندی ہر اسلامی ملک میں برابر قائم رہی۔

علامہ نے برصغیر میں مسلمانوں کے لیے اردو کو اختیار کرنے کی دعوت دی تو یہ اسی تمدنی عنصر کی وجہ سے ہے جہاں زبان کسی "مادری پدری" تعصب سے آلودہ نہیں تھی۔ اردو زبان، برصغیر کے مسلمانوں کے لیے اظہار کا ایک فطری وسیلہ تھی۔ برصغیر میں صدیوں کے لسانی عمل میں فارسی کی ثقافتی برتری مسلسل رہی کہ اسے سرکاری اور درباری تحفظ حاصل تھا، لیکن مقامی زبانوں کی ترقی کے عمل سے سماجی زندگی میں اردو نے اپنا دائرہ سرکاری سرپرستی کے بغیر ہی وسیع کر لیا اور دوسری بولیوں پر فوقیت حاصل کی۔ آخر اردو عملاً اظہار کا ناگزیر علمی و ادبی وسیلہ بن گئی اور مسلمانوں کی کئی ہزار سال کی تمدنی سرگزشت میں شامل ہوئی۔ اردو کی یہ ترقی پذیری کسی لسانی تعصب کا سبب نہیں تھی۔ پورے برصغیر میں عربی اور فارسی کے بعد اردو کا تیسرا درجہ تسلیم کیا گیا۔ دوسری ابھرنے والے مقامی زبانوں نے مقامی ضروریات تک اپنے آپ کو محدود رکھا۔ ان زبانوں کے اردو سے ٹکراؤ کا کوئی واقعہ ۱۸۵۷ء تک عالم اسلام کی تاریخ میں نہیں ملتا۔

برطانوی تسلط کے دور میں فارسی کا سماجی رتبہ انگریزی نے لے لیا۔ مغربی تعلیم نے مذہب سے کوئی واسطہ نہ رکھا اور تربیت ماں باپ کی ذاتی ذمہ داری قرار پائی۔ عربی ہمارے دائرہ فکر و عمل سے نکل گئی، فارسی کو انگریزی نے مٹا دیا۔ انگریزی کی برتری قائم ہوئی۔ یہ اقدام مقامی روایات کی جگہ بدیسی روایات کو اختیار کرنے کا تاریخی جبر تھا۔ اس سے فارسی عملی زندگی سے منہا ہوئی، اس کی جگہ بدیسی زبان، گھلے میں لگا کر رائج کر دی گئی جس سے معاشرتی اور طبقاتی تضادات رونما ہوئے۔ تاہم سماجی سطح پر از خود اردو کی نشوونما کا عمل جاری رہا کہ اس نے مسلمانوں کی سماجی زندگی میں موثر عنصر کے طور پر شرکت کر رکھی تھی۔

اس تناظر میں قومی جدوجہد آزادی میں انگریزی کی جگہ اردو کو سرکاری ذریعہ اظہار، اور قومی اور سرکاری زبان بنانے کی خواہش فی الحقیقت بدیسی جبر کے خلاف موثر احتجاج تھی اور یہ عمل اردو کو تحریک پاکستان میں اہم عنصر کے طور پر اختیار کرنے پر منتج ہوا تھا۔ علامہ کی زندگی میں ہندی اردو جھگڑے میں اردو کو سرکاری اور قومی زبان قرار دینے کا سبب، اردو زبان کی وہ داخلی حرکی قوت بھی تھی جس کے بل بوتے پر یہ زبان مسلمانوں کی تہذیبی وراثت کہلائی تھی۔ مسلمانوں اور دیگر اقوام کی مشترکہ میراث ہونے کے باوجود اردو کا مزاج اور علمی و ادبی سرمایہ، مسلمانوں کی کئی سو برس کی بود و باش کا ناگزیر حصہ بنا اور مقامی زبانوں کے مقابلے میں متوسط طبقے نے اس کو اپنے آئیڈیل کا درجہ دے دیا۔

حصول پاکستان کے بعد کئی نئی تبدیلیاں آئیں۔ ملک میں عدم استحکام نے بار بار مارشل لا کو دعوت دی، سیاسی عمل نے اخلاقی اقدار کو خیر باد کہا۔ ملی عزائم اور حقیقی زندگی کے درمیان فاصلے بڑھے، مرکز گریز طاقتوں نے علاقائی اور مقامی عصبیتوں کو ہوا دی، اور بدیسی تہذیبی یلغار نے عقیدے اور عمل میں فاصلے بڑھا دیے۔ حکومت کی نوعیت نظریاتی ہو یا سیکولر --- یہ سوال بار بار اٹھا کہ ذریعہ تعلیم کون سی زبان ہو؟ معاشرے میں طبقاتی تضادات بڑھتے گئے، یہ کش مکش کبھی شہری اور دیہاتی کے سوال کی صورت میں رونما ہوئی، کبھی غریب اور امیر کے مفادات کا مسئلہ بنی، کبھی مرکز اور صوبوں کے حقوق و اختیارات کی شکل میں سامنے آئی، کبھی قوم اور قومیتوں کے فرق میں متشکل ہوئی اور کبھی اس نے خالص لسانی سطح پر صوبوں کی تمدنی شناخت کا روپ دھارا۔ مرکز گریز طاقتوں کی اس نبرد آزمائی میں "ون یونٹ" کا قیام اور پھر اسے رد کرنے کی جدوجہد، لسانی مسائل کی مفاداتی حیثیت

--- یہ سارے معاملات ایک ہی بنیادی سمت کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جس کے قابل عمل حل سے ہم نے ہمیشہ آنکھیں بند کیے رکھیں۔

مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی علاحدگی کا سیاسی عمل اگر لسانی مسئلہ تھا تو پاکستان کی دو قومی زبانیں (اردو اور بنگلہ) بنا دینے کے بعد سارے جھگڑے ختم ہو جانا چاہیے تھے۔ مگر ایسا نہیں ہوا کیونکہ لسانی اختلافات تو اصل مرض نہ تھے، یہ تو دوسرے امراض کی علامات تھے۔ ہم علامتوں کے علاج میں لگے رہے اور اصل اسباب کی طرف سے غافل ہوتے چلے گئے۔

آج بھی لسانی اختلافات اور لسانی عصبیتیں مرض نہیں، مرض کی علامات ہیں۔ ضرورت تو اصل مرض کے علاج کی تھی، علامتوں کے علاج کی نہیں۔ ہم نے سیاسی مسائل کو لسانی اکھاڑ کی مدد سے حل کرنے کی کوشش کی اور ناکام رہے۔ مفادات کی "جنگ زرگری" میں برسر اقتدار طبقے (جو سرمایہ دار طبقہ ہے) کے مفادات کو اولین حیثیت حاصل تھی۔ یہ طبقہ اردو کی بجائے انگریزی کا حامی ہے۔ صوبائی سطح پر ہم ایک سے زیادہ زبانوں سے دوچار ہیں:

- صوبہ سرحد میں مشرقی پشتو اور مغربی پشتو کے علاوہ ایک علاقہ ہندکو کا بھی ہے۔
- سندھ میں سندھی، اردو، سرائیکی کے اپنے اپنے حلقے ہیں۔
- پنجاب میں لسانی طور پر پنجابی زبان کا نام اب صرف چند اضلاع تک رہتا نظر آتا ہے، سرائیکی، پوٹھوہاری اور دوسری بولیاں محدود کردار کی بجائے زبانوں کا درجہ لینے کے لیے کوشاں ہیں۔ سرائیکی صوبے کا نعرہ اس پر مستزاد ہے۔
- آزاد کشمیر میں کشمیری زبان کا رقبہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ گوجری اور میرپوری کے مطالبات بھی اٹھ رہے ہیں۔
- شمالی علاقہ جات میں آٹھ دس لسانی حلقے ہیں۔

اردو کا مقابلہ انگریزی کی بجائے ان لسانی مسائل سے کرنے کی کوشش جاری ہے۔ قوم کی جگہ قومیتوں کے تصورات نے لسانی جنگ کو اور بھی تیز کر رکھا ہے۔ زبانوں کو اظہار کا وسیلہ جاننے کی بجائے، ماں بولی کا تصور زبانوں کو "پوجا" کی چیز بنانے پر مصر ہے۔ اسی لیے تو نصف صدی پہلے علامہ اقبال نے قومیت کے مغربی تصور کی مخالفت کی تھی اور اسے اسلامی

معاشرے کے لیے بے حد خطرناک قرار دیا تھا۔ فکر اقبال میں سیاسی اور سماجی جدوجہد کا محور اس مسئلے کو بنایا گیا۔ اب حالات زیادہ دگرگوں ہیں۔

آج سائنسی ایجادات نے دنیا کے دور افتادہ ممالک کو قریب تر کر دیا ہے۔ ایک ملک میں رونما ہونے والے واقعات کی خبریں فوراً دوسرے ملک پہنچتی ہیں، اس کے ساتھ ثقافتی یلغار بھی بڑھ گئی ہے اور الیکٹرانک میڈیا کا دخل زیادہ ہو گیا ہے۔ ایسے میں بیرونی اثرات کے ردو قبول کے عمل کو کئی نئی اور مرکب صورتوں کا سامنا ہے۔ اس کی زد سب سے زیادہ ہماری اخلاقی قدروں پر پڑتی ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک اخلاقی قدریں اضافی نہیں بلکہ دائمی ہیں۔ علامہ ان قدروں کو معاشرتی زندگی میں بحال رکھنے کے حامی تھے۔ ان کے زمانے میں کش مکش اتنی تیز نہیں ہوئی تھی لیکن ہمیں تو کئی نئے چیلنج بھی درپیش ہیں۔ ان مسائل سے آنکھیں دوچار کرتے ہوئے ہمیں احتیاط سے کام لینا ہو گا، خصوصاً معاشرے کی طبقاتی تقسیم بہت توجہ چاہتی ہے۔ میں نے چند برس پہلے "پاکستانی قومیت کی تشکیل نو" میں جو کچھ لکھا تھا، اس میں سے ایک اقتباس آج کے خطبے کے اختتامیے کے طور پر پیش کرتا ہوں:

> نظام تعلیم کے حوالے سے "مادری زبان" کا مسئلہ اٹھایا جاتا ہے لیکن اصل مسئلہ مختلف صوبوں کے درمیان رابطے کا ہے، مادری تعصبات کا نہیں۔ اگر کسی ایک صوبے کی زبان بھی (چاہے وہ اکثریتی صوبہ ہی کیوں نہ ہو) باقی صوبوں کے لیے قومی سطح پر قابل قبول نہیں تو پھر اس کا حل وہی زبان ہو گی جو سب صوبوں میں یکساں طور پر سمجھی جاتی ہو اور ظاہر ہے کہ وہ انگریزی نہیں ہو سکتی۔ صوبائی سطح پر علاقائی زبانوں کو پوری طرح نشوونما کا حق ہے۔ علاقائی کلچر اور علاقائی زبانوں کو بنیاد بنایا جائے تو پھر صوبوں کے باشندے کو صوبائی سطح پر ایک زبان اور ملکی سطح پر دوسری زبان قبول کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

اس حالت کو نظام تعلیم کے حوالے سے دیکھا جائے تو ابتدائی درجوں میں آج بھی مضامین کی تدریس علاقائی زبانوں (ہی) میں ہو رہی ہے، لیکن تعلیم کے اعلیٰ درجوں میں بعض مضامین میں اردو ذریعہ تعلیم ہے، بعض میں انگریزی اور اردو یہ دو عملی تعلیمی نظام کے لیے بڑی تشویش ناک ہے۔ اس کے نتائج خاصے تباہ کن ہو رہے ہیں۔ ملکی

سالمیت کی خاطر یہ فیصلہ کرنا ضروری ہے کہ مستقبل میں کون کون سی زبان قومی ہو گی۔ صوبوں کی سطح پر اعلیٰ درجوں تک اگر ذریعہ تعلیم مقامی زبانیں بنتی ہیں تو پھر ان کے اور قومی زبان کے درمیان کوئی قابل عمل فارمولا وضع کرنا ہو گا۔ یہ حل اس بات پر منحصر ہے کہ مرکز میں کس زبان کو قومی سطح پر قبول کیا جائے اور قومی زبان کو امور ملکی میں جس بنیادی لسانی صلاحیت کی ضرورت ہے اس کا اہتمام کیا جائے۔

ظاہر ہے اگر صوبائی سطح تک صوبائی زبانیں رائج کی جاتی ہیں تو قومی زبان میں عمدہ صلاحیت پیدا کرنے کے لیے صوبوں کے نظام تعلیم میں اردو کے لیے کچھ خاص اہتمام کرنا پڑے گا۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک مرکز اور صوبوں کے تعلیمی محکموں میں اختیارات کی از سر نو تقسیم نہ ہو اور ملکی ضروریات اور صوبائی ضروریات میں حد فاصل قائم نہ ہو۔ ان حدود کے تعین سے مرکز گریز رجحانات کا خاص طور پر سد باب کرنا ہو گا تاکہ صوبائی اور قومی زبانوں کے درمیان ہم آہنگی ہو سکے۔

یہ مسئلہ بھی سوچنے اور غور کرنے کا ہے کہ ایک ترقی پذیر ملک میں افراد قوم کی زیادہ تر صلاحیتیں محض زبانیں سیکھنے کی نذر نہ ہو جائیں۔ ان سب مسائل کا تقاضا یہ ہے کہ لسانی معاملات کو ملکی مفادات کی روشنی میں طے کر کے زبانوں کی درجہ بندی کا طریقہ وضع کیا جائے۔ تعلیم کا مسئلہ بہرحال لسانی مسئلے کے قابل قبول حل کے بغیر طے نہیں ہو سکے گا۔ (پاکستانی قومیت کی تشکیل نو، ص ۴۲-۴۳)

تفہیم اقبال کے لیے فارسی زبان کی اہمیت

برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی میں عربی اور فارسی کی اساسی اہمیت رہی ہے۔ خود اردو زبان اپنے لسانی اور فکری پس منظر میں فارسی کی مرہون منت رہی ہے۔ عالم اسلام میں زبانوں کا مسئلہ کبھی بھی اختلاف کا سبب نہیں بنا۔ اسلام کی سماجی تاریخ، لسانی ترجیحات کے ایک مخصوص نظام کے تحت چلتی رہی ہے۔ مذہبی زبان کی حیثیت سے عربی کو ایک خاص امتیاز حاصل رہا، ثقافتی لحاظ سے مدتوں فارسی زبان کا دخل رہا اور اسے ایک خاص طرح کی تہذیبی برتری حاصل تھی۔ مسلمان جس علاقے میں بھی گئے وہاں کی زبان کو ان ترجیحات میں تیسرا نمبر حاصل رہا۔ اس لیے مسلمانوں کے نزدیک زبانیں کبھی بھی تفرقے کا باعث نہیں بنیں، بلکہ وہ اظہار خیال کا وسیلہ تھیں۔ ان سے کسی مادری پدری اصول کا تعلق نہ تھا۔

برصغیر پاک و ہند میں ترجیحات کا یہی نظام قائم رہا اور مسلمانوں نے زبانوں کو اظہار کے وسیلے سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ مغربی اثرات جب برصغیر پر مسلط ہوئے تو زبانیں قومیت کی پہچان قرار پائیں اور لسانی اختلافات کے شاخسانے اسی وطنیت اور قومیت کے تصورات کے ساتھ ابھرنے لگے۔ برطانوی تسلط کا ایک اور نتیجہ بھی ہوا کہ انگریزی زبان کو اب فارسی کی جگہ ثقافتی اہمیت حاصل ہو گئی۔ سرسید احمد خاں کے زمانے سے مسلمانوں میں انگریزی زبان اور مغربی علوم کے مطالعے کا شوق بڑھا، تمدنی اعتبار سے مسلمان دو طبقوں میں

بٹ گئے: ایک وہ طبقہ جو دینی علوم اور مشرقی زبانوں کا امین بنا اور دوسرے مغربی تعلیم سے بہرہ ور نوجوان نسل سامنے آئی۔ دونوں طبقے ایک دوسرے سے آشنا نہ تھے۔ مساجد میں تربیت پانے والی نسل جدید علوم سے آشنا نہ تھی۔ نوجوان نسل مذہبی علوم سے بیگانہ رہی۔ اس طرح بیک وقت دو تہذیبی دھارے ایک دوسرے کے متوازی بہتے رہے، گویا دونوں الگ الگ ملکوں کے باشندے تھے، جن کے درمیان منافرت کی دیوار حائل رہی۔ ان تضادات کے علاوہ ایک تضاد یہ بھی پیدا ہوا کہ مغربی تعلیم صرف تعلیم بن کر رہ گئی اور تربیت کا عنصر اس سے خارج ہو گیا۔ تربیت کی ذمہ داری ایک عرصے سے والدین کے حصے آرہی ہے اور وہ پرانا تعلیمی ڈھانچہ جس میں تعلیم و تربیت کی یکجائی پر زور دیا جارہا تھا، رفتہ رفتہ مؤثر عنصر کی حیثیت سے ختم ہوتا چلا گیا۔

علامہ اقبال کا بچپن اسی فضا میں گذرا۔ انہوں نے کچھ عرصہ مکتب میں تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد اسکول میں داخل ہوئے۔ اعلیٰ درجوں میں فارسی زبان ان کی تعلیم کا حصہ نہ تھی، بلکہ اس کی بجائے انہوں نے عربی کو اپنے خاص مضمون کے طور پر اختیار کیا۔ مگر جس تہذیبی فضا میں ان کی نشوونما ہوئی، فارسی کی جڑیں اس میں پوری طرح پیوست تھیں۔ فارسی کی ابتدائی تربیت میں شمس العلما میر حسن کا بڑا دخل تھا، جو اگرچہ عربی کے استاد تھے، لیکن فارسی سے بھی ان کا شغف کسی طرح کم نہیں تھا۔

علامہ اقبال نے اگرچہ ابتدا میں اردو شاعری کو وسیلہ اظہار بنایا، لیکن آگے چل کر انہوں نے اپنے پیغام کو عالم اسلام تک پہنچانے کے لیے فارسی زبان کو اختیار کر لیا۔ ان کا فارسی کلیات اردو کے مقابلے میں زیادہ ضخیم ہے، اور ان کی بہترین شاعری کے نمونے فارسی ہی میں ملتے ہیں۔ جاوید نامہ اور زبور عجم ان کی شاعری کا نقطہ عروج ہے۔

علامہ اقبال نے فارسی زبان کو وسیلہ اظہار کیوں بنایا؟ یہ سوال اپنی جگہ بہت اہم ہے۔ مذکورہ بالا اسباب کے علاوہ فارسی کی تہذیبی میراث اتنی قوی تھی، کہ علامہ اپنے افکار کو بیان کرنے میں فارسی کو زیادہ موزوں سمجھتے تھے۔ ان کے فکر کی بلندیاں فارسی شاعری کے ایک ہزار سال کے پس منظر سے وابستہ ہیں۔ اسی لیے انہیں بالآخر یہ کہنا پڑا کہ مجھ پر شاعری فارسی ہی میں وارد ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے اشعار میں بھی اس کا کئی جگہ ذکر کیا ہے۔

فارسی از رفعت اندیشہ ام
در خورد با فطرت اندیشہ ام

علامہ اقبال کی حیثیت پاکستان کے لیے ایک نظریاتی مفکر کی ہے، جس کے فکر کی توانائی سے پوری طرح آشنا ہونے کے لیے فارسی زبان سے واقفیت ناگزیر ہے۔ اردو کلیات کے ساتھ ساتھ فارسی کلیات کا مطالعہ ہمیں پورے تناظر سے آشنا کرتا ہے، اس لیے ہمارے لیے فارسی زبان کا مطالعہ ایک تمدنی اور تہذیبی ضرورت بھی ہے، جس کے بغیر فکر اقبال تک رسائی مکمل نہیں ہوتی۔

علامہ اقبال کے زمانے سے اب تک پل کے نیچے سے بہت سا پانی گذر چکا ہے۔ وہ تربیت جو والدین کا حصہ تھی، نفع پسندی کی تگ ودو میں ہمارے ہاتھ سے جاتی رہی۔ پاکستان کے عالم وجود میں آنے کے بعد ہماری ترجیحات بدل گئیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں زبانوں کی حیثیت کم ہوتی چلی گئی۔ انگریزی زبان پر ضرورت سے زیادہ انحصار کا نتیجہ ہے کہ ہم اپنی تمدنی روایات سے ناآشنا ہوتے چلے گئے۔ عالم اسلام سے ہمارے سیاسی رشتے بھی ایک بڑی حد تک منقطع رہے۔ ورنہ فارسی زبان کا مطالعہ ہمارے لیے ایک تمدنی ضرورت کے طور پر برقرار رہتا۔ تدریسی نظام میں سے فارسی کی اہمیت رفتہ رفتہ کم ہوتی چلی گئی۔ محکومی کے دور میں آرٹس کے ہر طالب علم کے لیے فارسی یا عربی سے کوئی ایک مضمون لینا ضروری تھا۔ اس لیے تین مضامین کا ایک ایسا گروپ بن گیا تھا، جس میں فارسی کو بوجوہ زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ پاکستان بننے کے بعد اسے پہلے ۹ مضامین کے زمرے میں رکھا گیا اور فی الوقت یہ زمرہ ۴۵ مضامین تک پھیل گیا ہے، اور تقسیم در تقسیم کے عمل سے فارسی پڑھنے والے طلبہ کی تعداد نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔ پہلے گھروں میں فارسی عربی کی ابتدائی تعلیم، تربیت کے وسیلے سے ہو جاتی تھی، وہ بھی اب نہیں رہی۔ نئی نسل اپنے ماضی سے کٹ چکی ہے اور زبانوں کا جو نظام بغیر کسی درسی توجہ کے خود بخود حاصل ہو جاتا تھا، ناپید ہو گیا ہے۔

کلام اقبال کی تفہیم میں فارسی کو نمایاں حیثیت حاصل ہے اور اس کے بغیر اقبال کی شاعری سے استفادہ ممکن نہیں۔ علامہ اقبال کے اردو کلام کے ذریعے ہم پورے اقبال تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ علامہ کے کلام کو پوری طرح جاننے کے لیے فارسی کا علم ناگزیر

ہے۔

علامہ کے کلام کی تفہیم ترجموں کے ذریعے ممکن نہیں۔ تراجم کی اپنی ایک اہمیت ہے مگر فکرواحساس کا کچھ حصہ ترجمے میں ضائع ہو جاتا ہے۔ مترجمین بھی فارسی پر وہ پہلی سی گرفت نہیں رکھتے۔ اس لیے کلام اقبال کے جو اردو تراجم بارکیٹ میں ملتے ہیں، ان سے اقبال کا ابتدائی تعارف تو ہو جاتا ہے، لیکن فارسی جانے بغیر تفہیم اقبال کا عمل ادھورا ہے۔

سیاسی اعتبار سے بھی اب یورپ کی بالادستی زوال پذیر ہونے کے بعد اور اشتراکی روس کی سلطنت کا شیرازہ بکھرنے کے ساتھ ساتھ عالم اسلام کی فکری وحدت کا جو تصور ابھرا ہے، اس سے یہ سارا خطہ فارسی زبان کا خطہ قرار پاتا ہے اور باہمی فکری، تمدنی، اقتصادی اور سیاسی ضرورتوں کے تحت فارسی کو ایک خاص اہمیت دیے بغیر ملک کے سیاسی اور تمدنی افق کو پوری طرح نمایاں نہیں کیا جاسکتا۔

پاکستان کے لیے ہی فکر اقبال اہمیت نہیں رکھتا بلکہ عالم اسلام بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ ایران کے انقلاب (۱۹۷۹ء) کے پس پردہ جو فکری روح کارفرما تھی، اس میں اقبال کی بصیرت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایران نے اقبال کے کلام سے فائدہ اٹھایا، مگر پاکستان اپنی جڑوں کی دریافت کے عمل میں ادھورے اقبال سے کام لے رہا ہے۔ اقبال کے کلام کی توانائیاں فارسی میں موثر طور پر سامنے آئی ہیں۔ پاکستان آج جس سیاسی تمدنی اور مذہبی اضطراب میں گرفتار ہے۔ اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ہم فارسی زبان کے وسیلے سے کلام اقبال تک رسائی حاصل کریں، کیونکہ علامہ اقبال کی اردو شاعری بھی فارسی کے پروں پر پرواز کرتی ہے، اور اس کی فکر کی رفعت فارسی کی آمیزش کے بغیر پوری طرح گرفت میں نہیں آتی۔

فصل سوم

پاکستان کے تعلیمی مسائل

پاکستان میں ذریعہ تعلیم کا مسئلہ

ہمارے ہاں لسانی مسئلے کی کئی شکلیں ہیں۔ میں اپنے آپ کو صرف چند نکات تک محدود رکھ کر بات کرنے کی کوشش کروں گا۔

ا

جب انگریز پنجاب پر قابض ہوئے تو مارچ ۱۸۵۹ء میں دہلی سے لے کر بلوچستان کے آخری سرے تک، ایک ہی صوبہ شمال مغربی صوبہ جات متحدہ کہلایا، سندھ اس وقت بمبئی کا حصہ تھا۔ سرحد پنجاب سے ۱۹۰۱ء میں اور سندھ بمبئی سے یکم اپریل ۱۹۳۶ء میں الگ ہوا۔ یہ جغرافیائی صورت حال کئی طرح سے اردو زبان پر اثر انداز ہوئی۔ پنجاب پر سکھوں کی اجارہ داری ختم ہوئے تھوڑا عرصہ ہوا تھا کہ ذریعہ تعلیم کا مسئلہ اٹھا۔ تعلیم یافتہ افراد کا ایک گروہ پنجابی کو ابتدائی جماعتوں میں ذریعہ تعلیم بنانے کے لیے کوشش کر رہا تھا۔ دوسرا گروہ اردو کے حامیوں کا تھا۔ کامیابی اردو ذریعہ تعلیم کو حاصل ہوئی۔ ابتدائی درجوں میں اردو کو بنیادی اہمیت دی گئی۔ اوپر کے درجوں میں انگریزی کو بطور ذریعہ تعلیم و امتحان اختیار کیا گیا۔ اس طرح تقریباً سو سال ہماری آپ کی ہڈیوں میں اردو رچی بسی رہی۔

دسمبر ۱۹۸۹ء - یہ خطبہ "حلقہ ادب، لاہور" کے خصوصی اجلاس میں دیا گیا، بعد ازاں انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد کے مجلہ "تعلیم" (اکتوبر ۱۹۹۱ء) میں شائع ہوا۔

اس وقت اردو کا یہ سلسلہ سرحد اور بلوچستان تک پھیلا ہوا تھا لیکن علاقہ سندھ میں سندھی میڈیم پر بھی زور دیا گیا۔ وہاں دو میڈیم چلتے رہے۔ کہیں (قصبات میں) ابتدائی درجوں میں اردو میڈیم تھا، کہیں (دیہات میں) سندھی لیکن اعلیٰ تعلیم اوپر کی جماعتوں میں انگریزی ہی رائج رہی۔ ان جملہ علاقوں میں انگریزی زبان کو نویں جماعت سے اوپر تک لازمی ذریعہ تعلیم کے طور پر رکھا گیا۔ نتیجہ یہ تھا کہ سندھ میں سندھی زبان اور انگریزی میڈیم کی بالادستی تھی۔ مڈل تک دیہی علاقوں کے سکولوں میں سندھی میڈیم چلتا رہا۔ اس کے متوازی اردو میڈیم سکول کراچی میں زیادہ رہے۔ ان جملہ علاقوں کے مستقبل میں متحد ہوجانے کے خوف سے انگریزی استعمار نے دو عملی کا سہارا لیا تھا، تاکہ یہ علاقے (سندھ اور پنجاب) آپس میں نہ مل سکیں۔ ان حالات میں پنجابی، بلوچی، بروہی، پشتو اور ہندکو میں سے کوئی زبان بھی ذریعہ تعلیم نہیں تھی۔ ڈسٹرکٹ سطح پر پولیس اور عدالتوں میں، سندھ میں سندھی اور باقی علاقوں میں اردو زبان بطور دفتری زبان موجود رہی۔

مدرسوں کی سطح پر، وہ نسل جو سندھ کی نچلی جماعتوں سے پڑھ کر آتی رہی، ان کے لیے دوسرے صوبوں کے مقابلے میں حالات مختلف رہے۔ اس بنا پر سندھ کے لسانی مسئلے کو آج آپ کو مختلف انداز میں دیکھنا ہوگا اور اس کا حل بھی مختلف تجویز کرنا پڑے گا۔ اردو اور صوبائی زبانوں کے درمیان فکر و عمل کی یک جہتی اور سندھی کے مسئلے کو بہرحال ایک الگ حقیقت کے طور پر تسلیم کرنا پڑے گا۔

تقسیم برصغیر کے بعد پنجاب میں ایف اے تک انگریزی کے ساتھ اردو میڈیم کی اجازت ہوئی اور بیشتر مدارس میں اسے اختیار بھی کیا گیا۔ پنجاب میں کچھ انگلش میڈیم اسکول تھے اور ان کے متوازی کچھ پبلک اسکول بھی تھے، کچھ ادارے گورنمنٹ کی نگرانی میں تھے (جیسے چیفس کالج وغیرہ) اور کچھ پرائیوٹ (بھی) ادارے تھے۔

۲

اگر سر سید احمد خان کے زمانے کی لسانی صورتِ حال کو طبقاتی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو نظر آئے گا کہ اس وقت متوسط طبقہ علوم و فنون کا اجارہ دار بنا اور وہی ruling elite

تھے۔ پاکستان میں ۲۰، ۲۵ سال میں جو اقتصادی تبدیلی پیدا ہوئی ہے، اس میں متوسط طبقہ تقریباً ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ اوپر والا طبقہ بہت اوپر چلا گیا ہے اور نیچے والا مزید نیچے آ گیا ہے۔ اس اقتصادی تفوق سے ایک نئی صورت حال پیدا ہوئی۔ جاگیر دار اور سرمایہ دار، نیا دولت مند طبقہ اپنے بچوں کو عام سکولوں کے بجائے چیفس کالج اور اسی طرح کے انگلش میڈیم سکولوں میں پڑھاتا ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی کا حامی نو دولتیہ طبقہ بھی ہے۔ اس پورے طبقے کی تعداد ملک میں نو فی صد سے زیادہ نہیں بنتی۔ یہی نو فی صد آبادی گریڈ ۱۷ سے اوپر کی اسامیوں پر حاوی ہے۔ عمومی یونیورسٹیوں میں اس وقت سماجی علوم میں اردو ذریعہ تعلیم و امتحان کی اجازت ہے۔ سماجی علوم کے ۹۰ فی صد مضامین اس وقت اردو میں پڑھائے جا رہے ہیں۔ لیکن یہ نچلا طبقہ بالعموم اعلیٰ ملازمتوں سے محروم رہ جاتا ہے۔ اگر آپ سی ایس ایس کے پچھلے چند برس کے اعداد و شمار دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ اس وقت دو تہائی سے زیادہ وہ لوگ مقابلے کے امتحان میں کامیاب رہتے ہیں جو انگریزی میڈیم سکولوں کی پیداوار ہیں۔ باقی میں آدھے لوگ انگلش میڈیم پرائیویٹ سکولوں سے تعلیم حاصل کرنے والے ہوتے اور صرف چند ایک اردو ذریعہ تعلیم کے ہیں۔ مجھے اس وقت ایک مقولہ یاد آ رہا ہے، اسٹالن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "معاشرے میں سب سے زیادہ منافق طبقہ مڈل کلاس ہوتا ہے۔ اگر حکومت اپر کلاس کی ہو تو وہ اس کے ساتھ مل جاتا ہے اور لوئر کلاس کی ہو تو اس کے ساتھ چل پڑتا ہے"۔

پاکستان میں انگریزی میڈیم سکولوں کی جو mushroom growth ہوئی ہے، اسے زیادہ تر مڈل کلاس ہی تقویت دے رہی ہے۔ اقتصادی لحاظ سے تو یہ طبقہ غریب ہے، لیکن عملاً اپنے آپ کو اعلیٰ طبقے میں ضم کر رہا ہے۔ یہ مڈل کلاس جو تیزی سے ناپید (eliminate) ہو رہی ہے، اپنے بچاؤ کے لیے اب اپر کلاس کا ساتھ دے رہی ہے۔ جس طرح حکومت نے میڈیم کی اجازت مختلف مضامین میں دی تھی، چاہیے تو یہ تھا کہ مقابلے کے امتحانات میں بھی ان مضامین میں یہ اختیار اور یہ اجازت ہوتی، لیکن ایسا نہیں ہے۔ اس لیے اپنی اولاد کو اعلیٰ ملازمتیں دلانے کے لیے دوسرے طبقات بھی مجبور ہیں کہ اعلیٰ طبقے کا ساتھ دیں۔

اب ایک لطیفہ سن لیجیے: مقتدرہ قومی زبان کے اوپر ایک اور مجلس بنائی گئی جو پبلک میں نہیں آتی، اسے کہتے ہیں کیبنٹ کمیٹی برائے نیشنل لینگویج۔ اس کا ڈھانچہ یہ ہے کہ اس

میں نامزد لوگ ہی لائے جاتے ہیں۔ مقتدرہ قومی زبان کا چیئرمین اس میں نان ووٹنگ ممبر کے طور پر بلایا جاتا ہے۔ اس میں دو تہائی سیکریٹری تھے، ایک تہائی صوبائی زبانوں کے ادیب شامل تھے۔ کمیٹی کے صدر وفاقی وزیر ہوتے تھے۔ تماشا یہ ہوا کہ مقابلے کے امتحانات کا مسئلہ اس کمیٹی کے سامنے آیا۔ یہ مسئلہ چار دفعہ کمیٹی کے سامنے لایا گیا۔ ایک دفعہ طے ہو گیا کہ اردو ذریعہ تعلیم کو ہر سطح پر اختیار کیا جائے گا لیکن اس فیصلے کو ریکارڈ نہیں کیا گیا۔ دوسری دفعہ مقابلے کے امتحانات اور ذریعۂ تعلیم کے معاملات کے بارے میں فیصلوں کو الٹ ریکارڈ کر دیا گیا۔ بالآخر میجر آفتاب حسن شور مچاتے مچاتے مقتدرہ ہی سے نکل گئے۔ اس کے بعد میرے زمانے (۱۹۸۳ء - ۸۸ء) میں جو فیصلہ ہوا، اسے بھی غلط ریکارڈ کیا گیا۔ اس پر میں شور مچاتا رہا مگر آج تک اس کارروائی کو درست نہیں کیا گیا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ صوبائی زبانوں کے ساتھ ایک "مصالحتی فارمولا" تجویز کیا جائے، اس پر کابینہ کمیٹی کے علاقائی زبانوں کے ماہرین نے مجھ سے اتفاق کر لیا۔ یہ طے پایا گیا کہ پہلے سے جس جس یونیورسٹی میں جو جو میڈیم رائج ہے، اسے مقابلے کے امتحان پر لاگو کیا جائے۔ یہ اختیار پہلے پانچ سال کے لیے دیا جائے گا، فارمولا پیش ہوا لیکن اسے بھی ریکارڈ نہیں کیا گیا۔ اگلے اجلاس میں مجھے بلایا گیا تو معلوم ہوا کہ سارے صوبائی زبانوں کے ماہرین اس سے باہر کیے جا چکے ہیں۔ ان کی جگہ دوسرے سیکرٹریوں کو بلایا گیا۔ گویا وہ کمیٹی دوبارہ تشکیل (reconstitute) ہو چکی تھی۔

۳

اس زمانے میں ایک دلیل یہ دی جاتی تھی کہ اردو میں فلاں فلاں موضوع پر کتابیں نہیں ہیں۔ میں نے اور میرے دوستوں نے مل کر اس کے لیے کام کیا۔ اصولی طور پر تو زبان کو نافذ کرنے کے بعد ہی کتابیں آتی ہیں اور صحیح کتابیں اسی وقت لکھی جا سکتی ہیں جب عملاً کوئی زبان نافذ ہو لیکن انھوں نے کہا کہ انڈے سے پہلے مرغی آنی چاہیے، ہم نے یہ بھی کیا۔ ہم نے ایک فارمولا بنایا کہ شروع سے لے کر ایم اے، ایم ایس سی تک کے ذہین طالب علموں کے لیے انگریزی اور دوسری زبانوں سے مواد اخذ کر کے اردو میں کتابیں لکھوائی

جائیں۔ اردو میں اطلاقی نفسیات کی جو کتاب اس وقت مقتدرہ قومی زبان سے شائع کی گئی، اس میں ۱۹۸۴ء تک کا علم موجود ہے، حالانکہ اس مضمون کی جو انگریزی کتاب پڑھائی جا رہی ہے اس میں ۱۹۵۰ء سے آگے کی کوئی چیز شامل نہیں ہے۔

اس کے علاوہ عام طالب علموں کے لیے ہم نے بنیادی نصابی کتب کے تراجم کا سلسلہ شروع کیا۔ پھر ہم نے رائے عامہ معلوم کرنے کے لیے تمام پاکستان میں مختلف سروے کروائے جو مقتدرہ سے چھپ چکے ہیں اور سرکاری افسروں کے لیے ان کے انگریزی ترجمے بھی شائع کیے جا چکے ہیں۔ میں یہ ترجمے پریس میں چھوڑ آیا تھا، وہ بھی چھپ کے آگئے ہیں۔ ایک سروے سارے صوبوں میں random sampling کے ذریعے کمپیوٹر پر کروایا گیا کہ کون سے علاقے میں کون سی زبان ذریعۂ تعلیم بنائی جانی چاہیے۔ پتہ یہ چلا کہ سندھ میں سارے شہر اردو کے حامی ہیں اور دیہات (جہاں صرف سندھی میڈیم تھا) سندھی کے حامی ہیں۔ دیہی آبادی ۷۰ فی صد تھی، مگر وہ بھی اردو کے مخالف نہیں تھے۔

۴

آج سندھ میں سیاسی حالت بگڑی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سماجی مسئلے کو سیاسی مسئلہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ مرکز گریز رجحانات بھارت نوازی کا نتیجہ بھی قرار دیے جاسکتے ہیں۔ اور ان کے بعض دوسرے اسباب بھی ہیں۔ جب مسئلہ مفاد کا ہو تو سیاسی جماعتیں اسے اپنے حساب سے استعمال کرتی ہیں۔ سندھ کی لیڈر شپ میں یہی عناصر صوبے کی سیاسیات میں فعال کردار ادا کر رہے ہیں۔ باقی رہا پنجابی زبان کا مسئلہ۔ میں گورمکھی بھی جانتا ہوں، اس کے علاوہ میں نے بارہ برس، ایم۔اے پنجابی کو پڑھایا ہے۔ پنجابی میں بھی لکھا، اردو میں بھی لکھا، فارسی اور انگریزی میں بھی۔ پنجابی کے مطالعے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ پنجاب میں پنجابی زبان کی لیڈر شپ جن سیاسی ہاتھوں میں ہے، ان میں ۹۰ فی صد بنیادی طور پر موجودہ پنجاب کے ہیں ہی نہیں۔ یہ لیڈر لوگ نہ پنجابی بول سکتے ہیں نہ لکھ سکتے ہیں۔ پنجابی تحریک سے متعلق سرگرم افراد کے نام سامنے رکھ کر دیکھیں تو پتہ چل جائے گا کہ اس تحریک کے مقاصد سیاسی ہیں۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ جب لاہور سے عبدالمجید سالک نے ماہنامہ

پنجابی ادب کا اجرا کیا، تو اسے پنجاب میں کوئی مالی اعانت کرنے والا نہیں ملا۔ کراچی میں مقیم بعض سرکاری افسروں نے اس کی مالی اعانت کی تھی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ پنجاب سے یہ علاقائی مسئلہ از خود نہیں اٹھا، اسے اٹھایا گیا ہے۔

۵

صدر ایوب خان مرحوم کے زمانے میں ملکی سالمیت کی حوصلہ افزائی کے لیے ماہرینِ نفسیات کی باقاعدہ ایک کمیٹی بنائی گئی تھی، اس کی روداد یں کانفیڈنشل ہیں، اس لیے میں ان کی تفصیل نہیں بتا سکتا۔ اس میں ملک کے بڑے بڑے نامور ماہرین نفسیات اور اردو میں لکھنے والے ادیب شامل تھے۔ ان اکابر نے یہ طے کیا کہ علاقائیت کی حوصلہ افزائی سرکاری سطح پر زور و شور سے ہونی چاہیے۔ اس کے بعد سرکاری سطح پر ہر ضلع میں اس کا بندوبست کیا گیا۔ مشابہت کے نکات پر زور دینے کی بجائے اختلافی مسائل کو زیادہ ہوا دی گئی۔ جب ایک چیز کی حمایت میں انتہا پسندی کا راستہ اختیار کیا گیا، یعنی زیادہ سے زیادہ اس مسئلے کو اچھالا گیا تو اس سے بجائے قومی یک جہتی کے، الٹا علاحدگی کے رجحانات کو تقویت ملی۔ اس وقت صوبائی زبانوں کے جتنے بھی سرکاری یا نیم سرکاری ادارے ہیں، اور ان میں جتنا کام ہو رہا ہے، وہ سارے کا سارا بیرون ملک بیٹھے ہوئے لوگوں کے نقطہ نظر کی ترجمانی ہے۔ وہ پاکستانی نقطۂ نظر سے نہیں ہے، حالانکہ ان زبانوں میں پاکستانیت کے عناصر بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ان کی حوصلہ افزائی ضروری تھی، لیکن انھیں کبھی اہمیت نہیں دی گئی۔ یہ سب کچھ سرکاری وسائل سے کیا گیا۔ سماجی کے علاوہ اس مسئلے کا ایک سیاسی پہلو بھی ہے جو آپ کے دیکھنے اور غور کرنے کا ہے۔

عوام میں علاقائی زبانوں اور صوبوں کی زبانوں کی حمایت کرنے والے کم ہیں اور سرکاری سطح پر سرکاری افسر اس کے زیادہ مؤید دکھائی دیتے ہیں، جو یہ زبانیں نہ تو لکھ سکتے ہیں اور نہ بول سکتے ہیں۔ مقصد شاید یہ ہو کہ اردو کی ان زبانوں کے ساتھ چپقلش ہو جائے اور انگریزی کا مستقبل مستقل طور پر محفوظ ہو جائے۔

دوسرا سروے سرکاری افسروں کا کرایا گیا تو پتہ چلا کہ گریڈ ۲۰ سے اوپر کے افسران

میں سے کسی کا بیٹا یا بیٹی اردو میڈیم سکول میں نہیں پڑھتے۔ گریڈ ۲۱ کے اوپر والے افسران کی بیگمات سے جب ذریعۂ تعلیم کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ یہ ہمارا مسئلہ ہی نہیں ہے، ہماری اولاد تو امریکہ، برطانیہ اور دوسرے ممالک میں پڑھتی ہے اور اکثر کی اولاد برسرِ روزگار بھی ہو چکی ہے۔

تیسرا سروے قوم کے عام طبقات کا تھا۔ ۹۰ فی صد لوگوں نے کہا کہ اردو ذریعۂ تعلیم ہونی چاہیے۔ اس میں سندھی اور دوسری زبانوں کا کوئی امتیاز نہیں، خود سندھ میں اردو کے حامی اکثریت میں ہیں۔

اس طرح چوتھا سروے ارکان اسمبلی کا ہوا۔ اسمبلی کا کوئی ممبر بھی یہ نہیں کہے گا کہ وہ قومی زبان کا مخالف ہے، لیکن عملی طور پر ان کی طرف سے قومی زبان کو کبھی کوئی تعاون نہیں ملا۔ میں نے جو سروے کرایا تھا، اس میں ۹۵ فی صد نے کہا کہ اردو دفتری زبان ہونی چاہیے لیکن عملاً کچھ نہیں ہوا اور نہ ہوگا۔ قومی اسمبلی (۱۹۸۸ء) اور سینٹ (۱۹۸۸ء) دونوں کو ملا کر تقریباً ۱۰۹ افراد چیفس کالج، آرمی سکولوں اور پبلک سکولوں یا آکسفورڈ کے پڑھے ہوئے ہیں۔ غور کیجیے اور دیکھیے کہ پاکستان میں وزارتیں کس طرح بنتی رہی ہیں۔ وزارت تعلیم ہی کو لیجیے۔ پہلے یاسین وٹو صاحب وزیرِ تعلیم ہوئے۔ وٹو صاحب اردو میڈیم تھے۔ انھیں اٹھا کے وزارت سے باہر کر دیا گیا۔ پھر وہ اپنے زور پر فنانس میں آگئے اور ان کی جگہ نسیم آہیر وزیرِ تعلیم ہوئے تو ان کو بھی چھ مہینے بعد چلتا کرنے کی تجویزیں ہوئیں۔ چیفس کالج گروپ نہیں چاہتا تھا کہ تعلیم پر پبلک سیکٹر سے پڑھا ہوا کوئی آدمی آئے۔ اس کے بعد چیفس کالج کے پڑھے ہوئے وزیر تعلیم سجاد حیدر صاحب آگئے، پھر دو تین آدمی اور آئے۔ یہ سبھی چیفس کالج وغیرہ کے پڑھے ہوئے تھے۔ اس سے اندازہ کر لیجیے کہ اسمبلی اور پارلیمنٹ کے اراکین میں دونوں طبقوں کو ملایا جائے تو کون سا گروپ غالب ہے۔ محمد خان جونیجو صاحب نفاذ اردو کی جرأت نہیں کر سکتے تھے، ان کے زمانے میں یہ ہوا کہ اس وقت ڈویژنل سطح پر جتنے نئے اسکول کھلے، ان سب کا ذریعۂ تعلیم پہلی جماعت سے انگریزی کر دیا گیا۔ اسلام آباد میں میں نے کوشش کی اور اصرار کیا تو دو عملی کا نظام وجود میں آگیا۔ اور ہر درس گاہ میں اردو اور انگریزی ذریعہ تعلیم کے الگ الگ فریق بنا دیے گئے۔ ہمارے مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین بے شک مقتدرہ قومی زبان کے گھوڑے پر سوار ہیں، مگر وہ گھوڑے کو چلائیں بھی،

صرف گھوڑے پر بیٹھنا تو کافی نہیں۔ گھوڑے کو چلانے کی شاید اب زیادہ ضرورت ہے۔

۶

ایک بات اور بھی عرض کر دوں کہ کوئی بڑے سے بڑا جمہوری ملک بھی اس وقت تک اپنے آئین میں موجود دفعات پر عمل در آمد نہیں کرتا، جب تک رائے عامہ اس کے پیچھے نہ ہو۔ اب مسئلہ رائے عامہ کو ہموار کرنے کا ہے۔ یہ معاملہ دو تین جہتوں سے پیچیدہ ہوجاتا ہے: ایک تو یہ کہ آپ کے نمائندے آپ سے اردو میں بات کرتے ہیں۔ وہ پبلک پلیٹ فارم پر اردو کو رابطے کی زبان رکھنا چاہتے ہیں (قومی زبان اور رابطے کی زبان دو مختلف اصطلاحیں ہیں) لیکن اس سے آگے نہیں۔ اس لیے کہ اس سے آگے ان کی اولاد کا مستقبل تاریک ہوجاتا ہے۔ ان کی اولاد اس مرحلے پر اردو نہیں پڑھ سکتی، شاید آپ کے علم میں نہیں کہ ایک تجویز وزیر اعظم محمد خان جونیجو مرحوم کے زمانے میں باقاعدہ وزارت قانون کو بھیجی گئی کہ اردو کے نفاذ کے متعلق دستور کی جو دفعہ ہے اسے بدل دیا جائے۔ اس میں ۱۵ اگست ۱۹۸۸ء کی بجائے as soon as possible کے الفاظ لکھ دیے جائیں۔ لیکن اسے اسمبلی میں لانے کی جرأت ابھی تک نہیں ہوئی۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی بات مانی جائے تو اس کے لیے رائے عامہ کو ہموار کرنا اشد ضروری ہے۔

۷

میرے استاد ڈاکٹر سید محمد عبداللہ آخری چھ سات سال میں بالکل مایوس ہوگئے۔ ایک تو انھیں اردو کی ترقی کے لیے جو امداد (چندے کی صورت میں) پبلک سے ملتی تھی، وہ سرمایہ داروں کی عدم دلچسپی کے سبب ختم ہو گئی۔ استاد مرحوم نے مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کو عملاً بند کر دیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ حکومت سے زیادہ پیسے لیں کیونکہ ان کے خیال میں گرانٹ لے کر اس کا بھی وہی انجمن ترقی اردو والا حال ہو جائے گا۔ اگر وہ اردو کا شور مچائیں گے تو سرکاری امداد بند ہو جائے گی۔ گویا آپ عملاً حکومت کی طرف سے دباؤ میں

ہیں۔ نجی شعبے میں سرمایہ دار اب اردو پر پیسہ نہیں لگاتے۔ یہاں لاہور میں مجھے پتہ ہے کہ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی اور انجمن ترقی اردو پنجاب کو چنیوٹ کے ایک صاحب سالانہ عطیات دیا کرتے تھے۔ اب وہ ہاتھ کھینچ گئے ہیں، بلکہ اردو کے مخالفین میں شامل ہیں۔ زمانے کا یہ رنگ دیکھ کر ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم مایوس ہو گئے تھے۔ اس کے بعد مقتدرہ کے ذریعے جب اردو کے کام کو آگے بڑھایا گیا، تو وہ کسی قدر خوش تھے۔ وہ مقتدرہ کی ہئیت حاکمہ میں تھے۔ بعض معاملات کے سلسلے میں کچھ کاغذات ان کے سامنے آئے تو بیماری کی حالت میں انھوں نے "ہائے اردو، وائے اردو" لکھا۔ یہ کاغذ اب تک میرے پاس محفوظ ہے۔

ان حالات میں احتیاط سے لائحہ عمل بنانے کی ضرورت ہے۔ یہ اردو کا کام جوش سے نہیں ہوگا۔ ایک طرف تو سندھ کے مسئلے کو ایک جداگانہ شق (sperate item) کے طور پر لینا ہوگا اور اس کا کوئی نہ کوئی قابلِ عمل حل دریافت کرنا ہوگا۔ پاکستان کے دوسرے صوبوں میں زبان کا کوئی مسئلہ نہیں۔ بلوچستان میں اس وقت چار زبانیں ہیں اور سبھی اکابر اردو پر متفق ہیں۔ سرحد میں کچھ عرصہ پشتو کا سوال اٹھایا گیا۔ آدھے سرحد میں ہندکو اور باقی آدھے میں پشتو کی دو شکلیں ہیں۔ ظاہر ہے اس صورت میں آدھے صوبے پر پشتو کو نافذ نہیں کیا جاسکے گا اور وہاں مزاحمت بھی ہوگی۔ ایک لطیفہ اور ہے کہ آج سے اٹھارہ برس پہلے مجھے جس وفد کے ساتھ چین جانے کا اتفاق ہوا۔ بیجنگ میں تو مترجم کے ذریعے کام چلتا رہا لیکن جب ہم وہاں گئے تو وہاں بیجنگ میں جو مترجم ہمارے ساتھ تھا، اس نے کہا کہ یہاں کی چینی میری سمجھ میں نہیں آتی، چنانچہ ہمیں دوسرا مترجم دیا گیا۔ عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں کوئی بھی ملک ایسا نہیں ہے جہاں پر دس دس بیس بیس میل کے فاصلے پر لسانی فرق نہ ہو۔ فرق یہ ہے کہ وہ انھیں قومی زبانیں نہیں کہتے۔ ہمارے لیے ایک مشکل یہ بھی پیدا ہوئی کہ اکادمی ادبیات کے پلیٹ فارم سے ایک تجویز اٹھائی گئی کہ ساری علاقائی اور صوبائی زبانوں کو پاکستانی زبانیں کہا جائے۔ اس طرح مقامی زبانوں کو قومی زبان کے برابر کر دیا گیا۔ ہمارے لیے اب یہ ایک مسئلہ ہو گیا کہ ہم جب صوبائی زبان کہتے ہیں تو دوسرا آدمی ہمیں مارنے کو آتا ہے، کہتا ہے کہ میری زبان تو پاکستانی زبان ہے۔ حالانکہ یہ استدلال آئین پاکستان کی متعلقہ دفعات کے خلاف ہے اب عوام کو اس مسئلے میں سیاسی طور پر اور عملی

طور پر educate کرنے کی بہت ضرورت ہے۔

۸

میں ابتداً انگلش میڈیم کا پڑھا ہوا ہوں۔ میں نے اردو کسی کلاس میں نہیں پڑھی، سوائے میٹرک کے۔ میں نے فارسی بھی انگلش میڈیم میں پڑھی ہے۔ میرا پی ایچ ڈی کا فارسی کا مقالہ انگریزی زبان میں تھا کہ وہ لازمی ذریعہ امتحان تھی۔ رہی یہ بات کہ مجھے اردو کس طرح آئی؟ جہاں تک میں سمجھ چکا ہوں، جتنی بھی مقامی زبانیں اردو سمیت ہیں، ان کی گرامر اور ان کا syntax یا ڈھانچہ ایک ہے۔ اردو مجھے اس طرح آئی کہ ہمارے گھر میں پنجابی بولی جاتی تھی۔ جب میں خط لکھتا ہوں تو اردو میں لکھتا ہوں۔ میں جب پڑھتا ہوں اردو میں پڑھتا ہوں یا انگریزی میں پڑھتا ہوں اور سوچتا ہمیشہ قومی زبان میں ہوں یہ صورت حال ہے جس میں مجھے قومی زبان آئی۔

ہمیں اس لسانی مسئلے کا حل تلاش کرنا ہوگا اور اس کا کوئی تدارک کرنا ہوگا کہ قومی زبان اور صوبائی زبانوں کے درمیان اشتراک کے پہلو زیر غور آئیں نہ کہ افتراق کے۔ یہ بھی توجہ طلب ہے کہ انگریزی ذریعۂ تعلیم جدا چیز ہے اور انگریزی بطور لازمی ثانوی زبان اختیار کرنا دوسری بات ہے۔ ہم اردو ذریعہ تعلیم کے قائل ہیں اور بطورِ زبان انگریزی کو لازمی طور پر پڑھانے کے حق میں ہیں۔ عموماً دونوں حیثیتوں کے درمیان خلط مبحث کیا جاتا ہے، جو مناسب نہیں۔

۹

ذوالفقار علی بھٹو صاحب کے زمانے میں لسانی مسائل پہلی بار (۱۹۷۲ء) شدّت سے اٹھے تھے۔ سندھ اسمبلی نے باقاعدہ ایک قرارداد کی صورت میں کہا: "انٹر میڈیٹ تک ذریعۂ تعلیم کی زبان آپشنل (optional) ہو گی۔ نیچے کی جماعتوں میں اردو لازمی مضمون کے طور پر پڑھائی جائے گی"۔ اسی زمانے میں یا شاید ایک دو سال بعد سندھ یونیورسٹی نے سندھی میڈیم کو ایم اے، ایم ایس سی تک پڑھانے کی اجازت دے دی۔ دو سال تک پانچ فی صد

لوگ سندھی میڈیم میں پڑھتے رہے، پھر سندھی کو سیاسی طور پر جبراً نافذ کیا گیا۔ یہ سندھ کی حالت تھی کہ جو مسئلہ ایک بار حل ہوگیا تھا، اسے پھر دوبارہ کھڑا کر دیا گیا ہے۔ اب رائے عامہ کو ہموار کرنا ضروری ہوگیا ہے اور ایسا جبھی ممکن ہوگا کہ اسمبلی قطعی اور حتمی پالیسی اختیار کرے۔

۱۰

مزید دو باتیں مختصر طور پر عرض کرنا چاہوں گا:

ایک تو یہ کہ ہمیں دیکھنا ہوگا کہ انگریزی کی حیثیت ہمارے ہاں کیا ہے اور کیا ہونی چاہیے؟ میرے نزدیک جس طرح دوسرے ملکوں میں (جہاں قومی زبان میڈیم ہے)، ایک زبان بطورِ لازمی ثانوی زبان پڑھائی جاتی ہے، انگریزی کو دوسری زبان کی حیثیت سے برقرار رکھنا ضروری ہے۔ بی اے، بی ایس سی تک بطور لازمی ثانوی زبان انگریزی کو چلنا چاہیے۔ علوم کے دروازے ہمیں اپنے آپ پر بند نہیں کرنے چاہییں۔

دوسرا یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ ۱۹۷۰ء سے سائنس میں علم کا دھماکہ ہوا۔ کمپیوٹر کی ایجاد، خلا کی تسخیر کی مساعی، اور دیگر سائنسی ترقیوں نے یک لخت سائنسی معلومات میں بے اندازہ وسعت پیدا کی۔ فرانس، جرمنی، چین اور جاپان نے اس سمت میں یک لخت علم کے دروازے کھول دیے سائنس اور ٹیکنالوجی میں بے پناہ پھیلاؤ پیدا ہوا۔ اب انگریزی کے ذریعے سائنس اور ٹیکنالوجی کا علم صرف ۵۰ فی صد تک محدود رہ گیا ہے، بقیہ ۵۰ فی صد دوسری زبانوں میں آرہا ہے۔ جرمن، روسی، فرانسیسی، چینی اور جاپانی زبانوں کے ذریعے۔

میرا فارمولا یہ ہے کہ کسی طالب علم کو اس وقت تک ایم ایس سی کی ڈگری نہ دی جائے جب تک وہ شام کے وقت ان زبانوں میں سے کم از کم دو زبانوں کا ڈپلومہ نہ لے لے، ورنہ سائنس دانوں پر علم کا دروازہ انگریزی جانتے ہوئے بھی بند رہے گا۔ جب تک آپ یہ نہیں کرتے، سائنس کے علم کی رفتار اتنی تیز ہے کہ ہر چیز کا ترجمہ کرنا ممکن نہیں۔ نہ یہ کرنا چاہیے۔ صرف اوسط درجے کے (average) طالب علموں کے لیے نصابی

کتب کا ترجمہ درکار ہو گا۔ ذہین طلبہ کے لیے اپنی زبان میں کتابیں تالیف (compile) کرنی پڑیں گی۔ یہ کام اردو میں ہونا چاہیے اور مسلسل ہونا چاہیے۔ درسی کتب کی جانچ کا صحیح معیار اس وقت تک ممکن نہیں جب تک آپ اپنا ذریعہِ تعلیم نہیں بدلتے۔ ذریعہ تعلیم کی تبدیلی اور درسی کتب کی تدوین، دونوں کام ساتھ ساتھ ہونے چاہئیں۔ آپ کہتے ہیں کہ ان میں سے ایک پہلے ہو۔ یہ صورتِ حال وہی ہے جس میں ہم اس وقت گرفتار ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں انگریزی کی برتری اب وہ نہیں رہی، جو ۱۹۷۰ء سے پہلے تھی۔ اس وقت بھی امریکہ اور انگلستان میں ۲۱ ادارے ایسے ہیں جو ترجمے کا کام کر رہے ہیں اور نئے مقالات کا ترجمہ فرمائش پر کرتے ہیں۔

۱۱

ایک اور بات عرض کردوں کہ جہاں تک بنیادی تعلیم (basic education) کا تعلق ہے، میٹرک اور ایف اے تک تعلیم قومی زبان میں ہونی چاہیے۔ بنیادی تصورات اس وقت تک واضح نہیں ہوتے جب تک آپ اپنی زبان کے حوالے سے علوم کو نہ پڑھیں۔ ہمارے ہاں اسی لیے سائنس کے استاد تو پیدا ہو رہے ہیں، لیکن سائنس دان نہیں پیدا ہو رہے اور نہ ہوں گے۔ اس لیے کہ سائنس کے طلبہ اور اساتذہ سائنس کی زبان میں سوچ ہی نہیں سکتے۔ ان پر بنیادی تصورات ہی واضح نہیں۔ اور نہ ہم نے عوام میں سائنس کا ذوق ہی پیدا کیا ہے سائنس کی تعلیم سے پہلے لوگوں کا سائنسی مزاج (science minded) ہونا ضروری ہے۔ ایسا نہ کر کے گویا ہم نسل کشی کر رہے ہیں اور قوم کو تباہی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ ہم نے بچوں کو پہلی جماعت سے انگلش میڈیم میں لگا رکھا ہے۔ ہم ابتدائی تعلیم اور اعلیٰ تعلیم دونوں کو آپس میں الجھا رہے ہیں۔ ان دو چیزوں میں فرق کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ ملک میں دو متوازی نسلیں پیدا ہوں گی: عمومی یونیورسٹیوں میں پاس ہونے والی الگ نسل اور انگریزی میڈیم سے آنے والی الگ نسل۔ جب میں انگلش میڈیم سکول کہتا ہوں تو اس سے مراد چیفس کالج، گھوڑا گلی، برن ہال، گرائمر سکول اور مشنری سکولوں کے ساتھ ساتھ وہ کھمبیوں کی طرح ابھرتے ہوئے سکول بھی ہیں، جو ملک کے طول و عرض میں جاری

ہیں اور جن میں انگریزی زبان مفادات کے حوالے سے ہم پر مسلط کی جارہی ہے۔

جب تک آپ کو اردو میڈیم کی اجازت نہیں ملتی (جو ہمارا آپ کا حق ہے) جب تک مقابلے کے امتحان میں قومی زبان کو ذریعہ امتحان بنانے کی اجازت نہیں ہوتی، قوم کی عام آبادی محرومیوں کا شکار رہے گی۔ میں کیوں چاہوں گا کہ اعلیٰ ملازمت میں میرا بچہ نہ آئے۔ میں تو پھر یہ منافقت کروں گا کہ بات اردو کی کروں گا مگر بچوں کو انگریزی پڑھاؤں گا اور پورے معاشرے کو برباد کرنے میں اپنا کردار ادا کرتا رہوں گا۔ منافقت کا یہ طرز عمل سماجی زندگی کی پہچان بنتا جارہا ہے اور یہی ہمارا المیہ ہے۔

مشرقی زبانیں اور تعلیمی اصلاحات

یہ احساس عرصے سے ہمارے ماہرین کو رہا ہے کہ ہمارا پرانا نظام تعلیم کئی اعتبار سے قومی ضروریات کو پورا نہیں کرتا۔ میکالے کی تعلیمی دستاویز میں جو نظریہ سامنے رکھا گیا تھا، اسے خود میکالے نے ہی واضح کر دیا۔ اس کے نزدیک برصغیر میں تعلیم کا مقصد محض برطانوی حکومت کے لیے ایسی جماعت پیدا کرنا تھا جو جسمانی لحاظ سے تو دیسی تھی لیکن ذہناً انگریز تھی۔ ایسی جماعت سے اس کے سوا کچھ توقع نہیں کی جا سکتی تھی، کہ محض افراد کا ایک گروہ بن جائے جو وقتاً فوقتاً برطانوی تفوق و برتری کا اقرار کرتا رہے۔ عرصے تک برطانوی حکومت کا یہ تعلیمی نظام اسی منصوبہ بندی کی بنیاد پر رہا تا آنکہ پاکستان وجود میں آ گیا۔ اب اسی ضرورت کو اور زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کیا جانے لگا۔

۱

اس سلسلے میں قدیم نظام تعلیم کی جو بنیادی خرابیاں سامنے آئیں، وہ یہ تھیں:

۱۔ ہمارے طلبہ کے ذہن محض نصاب کی کتابوں کے مندرجات کو بے سوچے سمجھے یاد کرنے تک محدود ہو گئے اور سوچ بچار کے لیے نئے راستے کھلنے کا امکان ختم ہو گیا۔ اس

۱۹۶۲ء میں قومی تعلیمی کمیشن کی سفارشات کے پس منظر میں مشرقی زبانوں کے حال اور مستقبل پر بحث کرتے ہوئے یہ یادداشت قلم بند کی گئی۔

سے غلامانہ ذہنیت پیدا ہوئی جو برطانوی استعمار کو تقویت دینے کا سبب بنی۔

۲۔ غیر زبان کو ذریعہ اظہار بنانے کی وجہ سے ہمارے طلبہ کی ذہنی نشوونما رکتی چلی گئی۔ اپنی زبان کی مدد سے علم حاصل کرنے میں جو سہولت ہو سکتی تھی، اس سے وہ محروم ہو گئے۔

۳۔ برطانوی اقتدار سے قبل مغلیہ دور حکومت میں مشرقی زبانوں کو جو اہمیت حاصل تھی، اور جسے ابتدا میں انگریزی حکومت نے اپنی بنیادیں مضبوط کرنے کا ذریعہ بنایا، میکالے کے بعد ختم ہو گئی۔ مشرقی علوم کی بقا کے بارے میں انگریز حاکموں کے ہاں ابتدا میں دو گروہ تھے۔ ایک مستشرقین کی وہ جماعت تھی جن کے خیال میں مشرقی زبانوں کا وجود برطانوی اقتدار کے لیے ضروری تھا۔ ان لوگوں کی رائے میں ان علوم میں نئے مغربی تصورات کو شامل کر کے انھیں کار آمد بنایا جا سکتا تھا۔ دوسرا گروہ یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ حکومت کو ان مضامین کی ترقی پر روپیہ خرچ کرنے کی بجائے اس رقم کو مغربی زبان و علم کی ترویج پر صرف کرنا چاہیے، اور ہندوستان کے غیر متمدن باشندوں کو تہذیب یافتہ بنانے کی سعی کرنی چاہیے۔ اس فضا میں میکالے کی تعلیمی دستاویز نے جنم لیا اور یہ قطعی فیصلہ ہو گیا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو آئندہ ایک نہایت ہی محدود پیمانے پر مقامی علوم کی سرپرستی کرنی چاہیے۔ لارڈ میکالے کی دستاویز کے بعض جملے مقامی زبانوں کے بارے میں زہر ناک حد تک تلخ و تند ہیں۔ اس سے ہمارے ہاں مغربی علوم کی حوصلہ افزائی اور مشرقی کہلانے والے ہر سرمائے کی مخالفت کی بنیاد پڑ گئی۔

۱۸۵۷ء کے بعد، نظم و نسق کے براہ راست حکومت انگلستان کے ماتحت آ جانے کی وجہ سے، حکومت کے لیے ایک واضح پالیسی اختیار کرنا ضروری ہو گیا۔ میکالے کا لگایا ہوا پودا اب بڑی تیزی سے بار آور ہونے لگا۔ انتظامی امور میں بعض جزئی تبدیلیاں اسی مرکزی درخت سے وابستہ تھیں۔ پنجاب یونیورسٹی کی تشکیل (۱۸۸۲ء) اور اس سے قبل اورینٹل کالج کا قیام (۱۸۶۴ء) بعض مستشرقین کی سعی کا نتیجہ تھا۔ ابتدا میں یہ طے ہوا تھا کہ مشرقی زبانوں کو اس یونیورسٹی میں بنیادی حیثیت حاصل ہو گی، لیکن یہ نقطہ نظر رفتہ رفتہ مختلف مراحل طے کرنے کے بعد ختم ہو گیا، اور یہاں بھی مشرقی علوم کی نمائندہ حیثیت قائم نہ رہ

سکی۔

۲

برصغیر کی تقسیم کے بعد نظامِ تعلیم کو پھر سے مرتب کرنے کی کوششیں کی گئیں، لیکن ان کی حیثیت کاغذی اور دفتری تھی۔

قومی تعلیمی کمیشن کے ارکان کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ نئے نظامِ تعلیم میں ان زبانوں کو، جن کی حیثیت ہمارے معاشرے میں ہمیشہ سے بنیادی رہی ہے، کیا جگہ دی جائے؟ تعلیم میں مذہب کو کیا دخل ہونا چاہیے؟ مشرقی علوم کی حیثیت کیا ہو اور ان کی تدریس کا انتظام کس نہج پر ہونا چاہیے؟ اروپائی زبانوں کے دوش بدوش مشرقی زبانوں، عربی اور فارسی کو کیا درجہ دیا جائے؟ یہ سوال ہماری تعلیمی ضروریات کے لیے بڑے اہم تھے۔

تعلیمی کمیشن نے مشرقی علوم اور زبانوں کی اہمیت کا اقرار کیا اور انھیں پاکستانی نوجوانوں کی ذہنی تربیت کے لیے ضروری قرار دیا۔ اس نے فارسی کا ذکر اگرچہ رپورٹ میں زیادہ مقامات پر نہیں کیا، تاہم تین مقام ایسے ہیں جہاں اس نے اپنی پالیسی کی خود ہی وضاحت کر دی اور عربی فارسی کی حیثیت کو ایک حد تک تسلیم کیا۔ ایک جگہ کمیشن نے یہ کہا کہ مشرقی علوم ہماری ملی زندگی کی اساس ہیں، نیز پاکستانی نوجوانوں کو ایک خاص ڈھانچے میں ڈھالنے کے لیے ان کا وجود ضروری ہے۔ یہ دونوں نکات اپنی جگہ پر نہایت اہم ہیں لیکن ان زبانوں کی تدریس کے اب دو مقصد ہوئے: ایک کاروباری اور دوسرا تہذیبی اور ثقافتی۔

ان سے چند اور منطقی نتیجے برآمد ہوتے ہیں جو بعض اوقات ایک دوسرے کی ضد بھی بن جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کمیشن کی سفارشات کو عملی صورت دینے کا موقع آیا تو ہمارے تعلیمی انقلاب کا خواب کثرتِ تعبیر کا نشانہ بن گیا۔ نصابی کمیٹیوں اور بورڈ آف اسٹڈیز نے ابتدائی درجوں سے لے کر یونیورسٹی کے درجوں تک تغیر و تحول کے لیے اس کھیل میں اپنا اپنا کردار ادا کیا۔ مشرقی علوم کے بارے میں کمیشن کی سفارشات کو ان کے سیاق و سباق سے الگ کر دیا گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمیشن کی سفارشات کی روح کو فراموش کر کے، مشرقی علوم کی حیثیت کو اس مقام سے بھی گھٹا دیا گیا، جو اسے پہلے حاصل تھا۔

تاویل اور تشریح کا حق مختلف اداروں کو ضرور حاصل ہے لیکن ہمارے خیال میں تعلیمی کمیشن کی بنیادی روح کے خلاف جو تاویل بھی ہو گی اسے صحیح قرار نہیں دیا جاسکتا، اور نہ وہ پاکستان کے لیے سود مند ہو سکتی ہے۔

مذکورہ بالا دو نکات کو ان کے سیاق و سباق میں رکھ کر دیکھا جائے تو کسی تضاد کا سوال مشکل ہی سے پیدا ہو گا، لیکن لارڈ میکالے کے نظام کی تربیت یافتہ جماعت کے بعض افراد ابھی تک اپنے قومی ورثے کو ہمدردانہ نقطۂ نظر سے دیکھنے کے عادی نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تاویلات کا ایک طویل سلسلہ کھڑا کر کے مشرقی زبانوں کی پرانی حیثیت کو بھی ختم کر دیا گیا۔ ملی فکر کی بنیاد کے لیے مذہب کی حیثیت کو کمیشن نے تسلیم کیا۔ مشرقی زبانوں کے ذخیرے کو بھی لامحالہ قوم کے لیے ضروری قرار دیا گیا جس میں ہمارے مذہبی تصورات، مذہبی عقائد اور دینی سرمائے کو ضروری قرار دیا گیا۔ یہ زبانوں کے جدید اور کاروباری سرمائے میں نہیں ہے۔ یہ انھی سانچوں میں ہے جنھیں ہم قدیم اور کلاسیکی شمار کرتے ہیں۔ اس طرح کلاسیکی سرمائے کی حفاظت اور اس کی تعلیم و تدریس لازمی ہو گی۔ لیکن دوسرا پہلو جو پہلے کی تردید معلوم ہوتا ہے، یہ ہے کہ عربی اور فارسی کی تعلیم و تدریس، بطور زندہ اور بول چال کی زبان کے کی جائے۔

اس کی وضاحت کے لیے ہمیں کمیشن کی رپورٹ سے رجوع کرنا پڑے گا۔ تعلیمی کمیشن کے مذکورہ فقرے کا سیاق و سباق یہ ہے کہ کمیشن نے ان افراد کے لیے، جو غیر ممالک سے وابستہ ہوں گے، فارسی عربی کو بطور بول چال اور زندہ زبانوں کے برقرار رکھنے کی سفارش کی ہے، نیز اس کی کاروباری حیثیت کو سامنے رکھا ہے اور یہ تجویز پیش کی ہے کہ حکومت اس مقصد کے لیے زبانوں کا ایک الگ مرکز قائم کرے گی، جس کا واضح مطلب یہی ہے کہ ان زبانوں کی کاروباری حیثیت کے لیے ایک جداگانہ تربیتی ادارہ قائم ہو گا اور مشرقی زبانوں کی عام رو سے اس کا کوئی رشتہ نہیں ہو گا۔ وہاں مذہبی اور تہذیبی معاملات اور کلاسیکی زبان ہی کو اہمیت حاصل رہے گی۔

۳

مشرقی زبانوں کی تدریس مدت سے ایک پیچیدہ مسئلہ رہی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں اس کی تدریس کا انداز دوسری زبانوں کی تدریس سے مختلف تھا۔ ہمارے ہاں انگریزی ہمیشہ سے پڑھائی جاتی ہے اور اس کی جدید شکل کو اہمیت حاصل رہی ہے، لیکن مشرقی زبانوں میں اس طریق کار کو نامناسب سمجھا گیا اور قدیم پر ہی زور دیا گیا۔ یہ تضاد طلبہ کی ذہنی تربیت میں حارج ہوتا رہا۔ مغربی زبانوں کی تدریس میں یہ اصول بھی ہمیشہ پیش نظر رہا کہ بچپن میں طالب علم کو بول چال کی زندہ زبان کی تعلیم دی جاتی تھی اور کاروباری پہلو پر زور ہوتا تھا۔ پھر درجہ بدرجہ اعلیٰ درجوں میں تمام و کمال کلاسیکی زبان پر اصرار کیا جاتا۔ یہ نقطہ نظر درست اور تعلیم کے لحاظ سے بہت مفید تھا۔ مشرقی علوم کے پڑھانے والوں نے اس کی طرف عام طور پر توجہ نہیں کی۔

آج بھی اگر ہم دوسری زبانوں کے انداز پر مشرقی زبانوں کے لیے یہ طے کر لیں کہ ابتدائی درجوں میں جدید فارسی اور جدید عربی زبان کی ترویج ہو گی، اور جیسے جیسے اعلیٰ درجوں کی طرف بڑھتے جائیں گے، کلاسیکی سرمایہ زیادہ سے زیادہ ہوتا جائے گا تو تعلیم میں یکسانی ہو جائے گی۔ لیکن جدید مشرقی زبانوں کی ابتدائی درجوں میں تعلیم کئی دوسرے مسائل پیدا کرتی ہے جن میں جدید زبان کے ماہر اساتذہ کی نایابی سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس روش کو اختیار کرنے سے ہمیں اسکولوں اور ثانوی درجے کی حد تک بعض مشکلات کا سامنا کرنا ہو گا۔ اس کے لیے اساتذہ کی خاصی تعداد کو ایران اور عرب ممالک میں بھیجنے کی ضرورت ہو گی۔ جب تک اس طرح کے تربیت یافتہ استاد میسر نہیں آتے، نچلے درجوں میں ہم جدید عربی اور جدید فارسی کو رائج نہیں کر سکتے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ قدیم اور کلاسیکی فارسی اور عربی کے مقابلے میں محدود تناسب سے جدید فارسی اور عربی کو رائج کر دیا جائے۔ یہ عمل آٹھ دس سال کی مدت میں نچلی جماعتوں میں رائج ہو سکتا ہے۔ وہ اساتذہ جو جدید زبانوں کی خیر خواہی کے خیال سے انھیں صرف چند روز میں رائج کرنے کے خواہش مند ہیں، ہمارے خیال میں اپنے مضمون کے ساتھ دیانت دارانہ سلوک نہیں کر رہے۔ اس طرح جدید زبانوں کو ٹھونس کر، وہ انھیں غیر مقبول بنا دیں گے۔ پچھلے پانچ سات برس میں سکولوں کے درجے میں فارسی کے

ساتھ کچھ ایسا ہی سلوک ہوتا رہا ہے، جس سے اساتذہ کے طبقے میں جدید بول چال کی زبانوں کے خلاف ردعمل پیدا ہوا۔

تعلیمی کمیشن کی سفارشات کے بعد بول چال اور جدید زبانوں کی تدریس کے حامی ماہرین تعلیم، اب اسکولوں کی طرف سے مایوس ہو کر کالجوں کی طرف لوٹ آئے ہیں۔ ثانوی تعلیمی مدارس سے لے کر ایم اے تک، جدید زبان کا نعرہ آج کل کچھ زیادہ ہی سننے میں آرہا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی اور مغربی پاکستان ثانوی تعلیمی بورڈ نے جو نصاب رائج کیے ہیں، ان میں یہ رجحان بخوبی ابھر رہا ہے کہ ثانوی تعلیمی درجے سے لے کر ایم اے تک، فارسی اور عربی زبان میں کلاسیکی سرمائے کو خیرباد کہہ دیا جائے۔ گاڑی کو گھوڑے کے آگے جوتنے کا یہ طریقہ نہ صرف کمیشن کی سفارشات کی روح کے منافی ہے، بلکہ اس کی زد مشرقی زبانوں کے مفاد پر بھی پڑتی ہے۔

دوسری زبانوں کی طرف ہمارا نقطۂ نظر تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ ہم جدید سے کلاسیک کی طرف آتے، کاروباری زبان سے علمی اور تہذیبی سرمائے کی طرف رُخ کرتے، یعنی ابتدائی درجوں میں فارسی اور عربی کی تعلیم و تدریس، جدید اور زندہ زبان کے طور پر کرتے اور اعلیٰ ثانوی درجے تک ان زبانوں کو بطور زندہ زبانوں کے پڑھانے کا کام ختم ہو جاتا اور کلاسیکی ادب اور تہذیبی سرمائے پر توجہ زیادہ ہوتی۔ چھ سال کی مدت ایک نئی زبان سیکھنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ طالب علموں میں اس منزل تک عربی اور فارسی زبانوں میں لکھنے پڑھنے اور اپنے مافی الضمیر کو بیان کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جانی چاہیے تھی۔ اگر ایسا نہیں ہو رہا تو اس خرابی کا سبب تعلیمی نظام اور سماجی محرکات میں تلاش کرنا چاہیے۔

۴

بی اے اور ایم اے کے درجے پر ان زبانوں کا وہ سرمایہ، جسے تعلیمی کمیشن کی سفارشات، قوم کے لیے لازمی قرار دیتی ہیں، پیش نظر ہونا چاہیے تھا۔ طالب علم جب ایم اے کر چکے تو اسے مشرقی علوم پر حاوی اور ان زبانوں میں موجود مذہبی سرمائے سے پوری طرح واقف ہونا چاہیے۔ جدید فارسی اور جدید عربی کے حامی یہاں بھی خالص جدید زبان کی داغ

بیل ڈالنا چاہتے ہیں۔ یہ رجحان بعض نصاب کمیٹیوں میں ترتیب دیے جانے والے نصابات سے بخوبی واضح ہے۔

نام نہاد "جدت پسندی" کے حامی اساتذہ ایم اے کے نصاب میں صرف دو سو صفحے کے قدیم ادب کے انتخاب کی سفارش کرتے ہیں، اور باقی سات پرچوں کو (جن میں ایک پرچے کا اضافہ بھی کیا گیا) محض عمومی مواد کی تحصیل کا ذریعہ بنایا گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایم اے کے طالب علم کو مواد کے طور پر صرف دو سو ورق پڑھنے ہوں گے، باقی مطالعہ وہ محض ایران کی تاریخ اور ایران کے جغرافیے وغیرہ کا کرے گا۔ یہ صورت حال اگر اسی طرح قائم رکھی گئی تو مجھے اندیشہ ہے کہ ہم اپنے مضامین سے دیانت دارانہ سلوک نہیں کریں گے۔ ایسے نصاب کو پڑھ کر جو طالب علم کالج سے نکلے گا، وہ فارسی کے بارے میں تو بہت کچھ جانتا ہو گا لیکن خود فارسی زبان و ادب پر اس کی مہارت مشکوک ہو گی۔ ہماری رائے میں جدید فارسی اور جدید عربی کی تعلیم دس بارہ سال کی مدت تک اعلیٰ ثانوی درجے تک مکمل ہو جانی چاہیے اور اس کے بعد کلاسیکل سرمائے پر پوری توجہ صرف کرنی چاہیے۔ یہی طریق کار دوسری زبانوں میں اختیار کیا گیا ہے۔

ہم نے ابھی عرض کیا تھا کہ تعلیمی کمیشن کی سفارشات میں قدیم علوم اور زبانوں کے بارے میں اگرچہ اظہار خیال مختصر ہے لیکن اپنی جگہ پر پوری طرح واضح ہے۔ کمیشن (جہاں تک ہم سمجھتے ہیں) ہرگز اس چیز کا مدعی نہیں کہ عربی اور فارسی کو کالجوں میں جو درجہ پہلے حاصل تھا، وہ ختم کر دیا جائے، اور نہ غالباً ان کی یہ نیت معلوم ہوتی ہے کہ کالجوں میں مشرقی امتحانات کو غیر ضروری اور ناکارہ بنا دیا جائے۔

اعلیٰ ثانوی درجے پر پہلے عربی، فارسی اور اردو کی یہ پوزیشن ہوتی تھی کہ آرٹس کے طالب علموں کو مشرقی زبانوں میں سے ایک زبان کو لینا لازمی تھا۔ اب نئی گروہ بندی میں یہ تینوں زبانیں دوسری کئی زبانوں کے گروہ میں شامل کر دی گئی ہیں۔ نیز "جدت پسندی" کے غلط اصرار کی وجہ سے اب کالجوں میں ان علوم کے پڑھنے والوں کی تعداد، تقسیم در تقسیم کے زیر اثر، پہلے کے مقابلے میں ایک چوتھائی سے بھی کم ہو گئی ہے۔ کالج میں داخل ہونے والے آرٹس کے طالب علموں میں فارسی یا عربی لینے والوں کی تعداد بہت ہی قلیل ہو گئی ہے۔ بی اے کے درجے میں بھی عربی اور فارسی کی حیثیت پہلے سے مختلف ہے۔ پہلے ان

زبانوں سے سائنس کے طالب علم بھی کچھ نہ کچھ واقف ہو جاتے تھے۔ عملاً آپشنل مضمون ختم ہو جانے کی وجہ سے ان زبانوں کے پڑھنے والے اور بھی کم رہ گئے ہیں۔ اس کے علاوہ جدید اور بول چال کی زبان کو بتدریج رائج کرنے کی بجائے فوری طور پر رائج کرنے کی غیر فطری کوشش کے سبب یہ زبانیں غیر مقبول ہو رہی ہیں۔ کالجوں کے اعداد و شمار سے یہ بات بخوبی سامنے آ جاتی ہے۔

کالجوں کے علاوہ مشرقی زبانوں کے "عالم فاضل" امتحان بھی توجہ کے محتاج ہیں۔ اس سلسلے میں چیئرمین بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن نے نو افراد کی ایک کمیٹی بنائی تھی اور اس نے مہینہ ڈیڑھ مہینہ کچھ کام بھی کیا تھا، لیکن اس کی سفارشات منظر عام پر نہیں آئیں، اس لیے ہم اس پر اظہار رائے سے قاصر ہیں۔

۵

کمیشن کی سفارشات ملت کے ایک دیرینہ تقاضے کو پورا کرتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان سفارشات کو عمل میں لاتے وقت ہم رپورٹ کے بنیادی مقصد کو نظر انداز نہ کریں۔ مجھے افسوس ہے کہ بعض تاویلات نے کمیشن کی سفارشات کے اصل مقاصد کو اگر پوری طرح نظر انداز نہیں کیا تو مجروح ضرور کر دیا ہے۔ تعلیم کے سر برآوردہ لوگوں سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اپنے ذاتی تعصبات اور دور از کار اندیشوں سے بالا ہو کر، ملی مفاد اور قومی مقتضیات کو پیش نظر رکھیں اور مشرقی علوم کو ان کا وہ حق دلائیں جو غیر ملکی حکومت اس سے چھین چکی تھی۔ اس سے مغربی علوم کا وجود قطعاً خطرے میں نہیں پڑتا۔

ضرورت ہے کہ ان زبانوں کو اس مغربی سائنٹی فک سانچے سے بھی آشنا کرایا جائے جس کے بھروسے پر ہمارا ملک اور ہماری ملت ترقی کر سکتی ہے۔ تعلیم کا سوال ہمارے ہاں محض ایک نظام کو بدلنے کا سوال نہیں بلکہ قوم کے مستقبل کا بھی سوال ہے۔ اس میں ذاتی وقار، قدیم غلامانہ ذہنیت اور اپنے سرمائے سے نفرت کو دخل انداز نہیں ہونے دینا چاہیے۔ یہ معاملہ اصولوں کا بھی ہے اور نیتوں کا بھی۔

۶

ابتدائی جماعتوں کے نصاب میں جن بنیادی باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے، وہ یہ ہیں:

۱۔ جس درجے کے نصاب کی تدوین مقصود ہو، وہ اس درجے کے طلبہ کی ذہنی سطح کے مطابق ہو۔

۲۔ کتاب کی تالیف میں ہمارا بنیادی مقصد کیا ہے؟ اگر صرف زبان سکھانا ہے تو کس درجے تک کتنا ذخیرۂ الفاظ درکار ہو گا۔ اس ذخیرۂ الفاظ میں مؤلف کو عام ضروریات کا لحاظ بھی رکھنا ہو گا، مثلاً کاروباری ضروریات، گھر کے استعمال کی اشیا، عام رسم و رواج وغیرہ۔

۳۔ کردار کی تعمیر میں ممد و معاون ہونے والے افکار و خیالات کو بھی جگہ ملنی چاہیے۔

۴۔ آگے چل کر طالب علم کو کن علوم کی تعلیم دینا ہے، اس کے لیے ایک حد تک زمین ہموار کرنا درسی کتابوں کے لیے لازم ہے۔

۵۔ مشرقی زبانیں جہاں بول چال کی زبانیں نہیں ہیں، ان کی تدریس غیر زبانوں کے طور پر کرنی ہوتی ہے، اس کے دو بنیادی مقصد ہیں:

- زبانوں کے کاروباری اور بول چال کے پہلو کو پیش نظر رکھ کر ایسا ذخیرہ الفاظ مہیا ہو جو طالب علم کی روزمرہ کی ضروریات کے اظہار میں کام آسکے۔
- ملی اور مذہبی تصورات و عقائد کو ذہن نشین کرانے کے لیے معاشرے کے بعض پہلوؤں پر مواد فراہم ہو۔ یہ مواد عام زبان میں ہونا چاہیے لیکن اس کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ یہ مواد بالآخر قدیم سرمائے تک لے جانے میں معاون ہو۔ ہمارے بچوں کے لیے مشرقی علوم کی اہمیت دو طرفہ ہو جاتی ہے۔ ہمیں روزمرہ کی زبان سے چل کر اعلیٰ درجوں میں کلاسیکی زبان اور علمی اور مذہبی سرمائے تک جانے کی ضرورت ہے۔ دوسرے ہمیں نصاب کی کتابوں میں ابتدائی جماعتوں سے اعلیٰ ثانوی کے درجے تک زبانوں کی کاروباری حیثیت پر بھی زور دینا ہو گا۔ موخر الذکر مقصد کے حصول کے لیے اسباق میں ملی تعمیر نو کا سامان کرنا پڑے گا۔ ہائر سیکنڈری سے اوپر کے

درجوں میں کلاسیکی زبان کا اجرا، اس ملی مقصد کے لیے مفید ہے کیونکہ اسی وسیلے سے اپنے تہذیبی ورثے تک رسائی ممکن ہے۔ گویا ان دوگونہ مقاصد کی تکمیل قدیم و جدید ہر دو سرمائے ہی سے ممکن ہے۔ ہمیں کم از کم ہائر سیکنڈری کے درجے میں جدید اور قدیم زبانوں کا ایک ایسا تناسب مقرر کرنا پڑے گا جو اعلیٰ تعلیمی درجوں میں جا کر مکمل طور پر کلاسیکی زبان میں ڈھل جائے، تا کہ ہم بالآخر ان زبانوں کے وسیلے سے اپنے ملی سرمائے تک رسائی حاصل کر سکیں۔

فارسی اور عربی کی تعلیم و تدریس میں مذکورہ بالا مسائل کا خیال بالکل نہیں رکھا جا رہا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری درسی کتابیں ناکارہ ثابت ہو رہی ہیں اور طالب علم ان زبانوں کا سال ہا سال تک درس لینے کے باوجود، جب کالج کی منزل پر آتا ہے تو بالکل کورا ثابت ہوتا ہے۔ خلیفہ عماد الدین کی کتابوں سے لے کر، جو ہماری ضروریات کو کلاسیکی زبان کی حد تک بہت اچھی طرح پورا کرتی ہیں، محکمہ تعلیم کے موجودہ نصابات تک میں یہ خامی موجود ہے۔

۷

ابتدائی درجوں کی زبان کی تدریس کے لیے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کون سے الفاظ ہماری ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ ہمارا اصل مقصد کیا ہے۔ آیا ہمیں بچے کو محض کاروباری زبان کا ذخیرہ دینا ہے؟ اسے مجلسی ضروریات کو پورا کرنے والے الفاظ سکھانے ہیں؟ اسے ادبی زبان سے روشناس کرانا ہے؟ یا اسے بول چال کی زبان کی حد تک مشرقی زبانوں کا درس دینا ہے؟ یہ سوال بھی اہم ہے کہ بول چال کی شائستہ زبان کا حصہ طالب علم کے زیر مطالعہ رہنا چاہیے یا اسے عامیانہ زبان اور slang سکھانی ہے؟ --- یہ وہ مسائل ہیں جن کو حل کیے بغیر مشرقی زبانوں کی درسی کتب نہیں لکھی جا سکتیں۔

ہماری اولین ضرورت یہ ہے کہ ان سوالوں کا تسلی بخش حل تلاش کریں اور پھر اس کی روشنی میں الفاظ کی تلاش و جستجو کریں۔ ان کی باقاعدہ درجہ بندی کر کے یہ فیصلہ کریں کہ چھٹی کے نصاب میں فلاں فلاں لفظ آئیں گے، ساتویں کے درجے میں الفاظ کی یہ تعداد ہو گی،

آٹھویں میں یہ ہو گی، دسویں اور ایف اے میں یہ تعداد اتنی ہو گی۔ فارسی زبان کی ابتدائی درسی کتابوں کو لیجیے۔ ان میں اس طرح ذخیرہ الفاظ کی گروہ بندی مطلق نہیں کی گئی۔ بعض اوقات ایک ہی حکایت چھٹی کے نصاب میں بھی شامل ہے اور وہی حکایت دسویں اور ایف اے کے نصاب میں بھی ملتی ہے۔ اس سے طالب علم کا ذہن انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ گلستان کی بعض حکایات کے ساتھ ہمارے درسی مصنفین یہی سلوک کر رہے ہیں۔ ساتویں جماعت کی درسی کتاب کی بعض حکایتیں آج بھی ایف اے کے جدید نصاب میں شامل ہیں۔ کیا ہم اس سے یہ نتیجہ نکالیں کہ ساتویں جماعت میں طالب علم کے ذہن کی جو سطح ہے، وہی ایف اے میں بھی قائم ہے؟

درسی کتابوں کی دوسری بڑی قباحت یہ ہے کہ ایک حکایت میں پانچ سات نئے الفاظ آتے ہیں۔ چاہیے تو یہ کہ اس کتاب میں وہی الفاظ دو تین بار دہرائے جاتے، تا آنکہ طالب علم کے ذہنی افق کا حصہ بن جائے۔ لیکن درسی کتب میں یہ التزام نہیں، حالانکہ فارسی اور عربی کی تعلیم دینے والے اساتذہ جانتے ہیں کہ دنیا کی کوئی زبان سکھانے کے لیے الفاظ اور جملوں کی تکرار ناگزیر ہے۔

ان کتب کی تیسری خرابی یہ ہے کہ ان میں ایسے درس شامل ہیں، جن کا طالب علم کے روزمرہ کی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں۔ جدید فارسی کو فروغ دینے کی خواہش میں اگر ہم ایران کے جغرافیے اور انگلستان کے باغوں اور پھلوں کا ذکر لے بیٹھیں گے تو پاکستانی طالب علم کا ذہن اجنبیت کی فضا سے مانوس نہ ہو گا۔ اس کے لیے تو مقامی رسم و رواج اور پاکستان کا جغرافیہ ہی پاکستانی طالب علم کے لیے زیادہ مفید ہو سکتا ہے۔ جب تک مشرقی زبانوں کے نصابات میں طالب علم کا قریبی ماحول شامل نہیں ہوتا، وہ ان زبانوں سے روشناس نہیں ہو سکتا۔

جدید فارسی کی تعلیم دینے والے گروہ میں زبان و محاورہ کے سلسلے میں بھی کوئی واضح نقطۂ نظر نہیں ہے۔ بول چال کے نام پر ایران کی شہری زندگی کی بول چال ہی نہیں، وہاں کے دیہاتی محاورے اور الفاظ بھی شامل نصاب کر دیے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ فارسی زبان کے ایم اے پاس طالب علم بھی ایک ایسی کھچڑی زبان سیکھتے ہیں جن پر خود ایرانی اساتذہ کو ہنسی آتی ہے۔ یہی خامی ابتدائی درسی کتابوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ ہماری قومی ضروریات کے

لیے جدید کی وہ اہمیت نہیں ہے جو قدیم کی ہے۔ نیز اعلیٰ درجوں میں ہمارا مقصد بول چال کی حد سے گزر کر علمی، مذہبی اور ثقافتی ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ ہمیں علمی ذخیرۂ الفاظ اور ادبی زبان پر شروع ہی سے زور دینا لازم ہوگا۔ بول چال کی زبان بھی ساتھ ساتھ چلے گی لیکن اس کا پلہ بھاری نہ ہوگا۔ مغربی زبانوں کی تدریس میں یہی اصول ہمارے سامنے رہا ہے۔

انگریزی سکھاتے وقت ہم مہذب انگریزوں کی بول چال اور ادبی زبان سکھاتے ہیں، دیہاتی زبان ہمارے نصابوں میں شامل نہیں۔

آخر فارسی کے نصابوں میں سلینگ یا دیہاتی زبان کو معیاری زبان کے ساتھ ملا کر کیوں پیش کیا جاتا ہے۔

۸

پاکستان کا تصور ایک مخصوص پس منظر کا حامل ہے۔ اس کے محرکات ہماری ملی زندگی سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ جن مذہبی تصورات کو لے کر ہمارے نوجوانوں کو آگے بڑھنا ہے، مادی اور روحانی قدروں کے جس امتزاج سے مستقبل کے پاکستانی کو وجود میں آنا ہے، اس کی بنیاد انھی کتابوں پر رکھی جائے گی۔

سائنسی علوم کی اہمیت سے انکار نہیں، ان سے متعلق ذخیرۂ الفاظ بھی ان کتابوں میں ضرور آنا چاہیے لیکن روزمرہ کے مواد اور سائنسی مواد کے درمیان کوئی نہ کوئی تناسب ضرور مقرر کرنا ہوگا۔ یہ سارا مواد بلاشبہ جدید فارسی اور جدید عربی زبانوں میں لکھا جائے گا لیکن اسے پاکستانی ذہن کی پیداوار ہونا چاہیے۔ ایک ایسے مسلمان ذہن کی پیداوار، جو دین اور دنیا میں مغائرت نہیں دیکھتا، بلکہ اس کے امتزاج سے صحیح قومی ذہن کی تشکیل کرنا چاہتا ہے۔

ہمارے ماہرین تعلیم کا فرض ہے کہ وہ اس حیثیت سے بھی درسی کتابوں کا جائزہ لیں۔ درسی کتابوں میں جو مواد ہونا چاہیے اس کا غالب حصہ ایک نقطۂ نظر پر مشتمل ہونا لابدی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ہم محض کاروباری ضروریات اور سائنسی علوم کے لیے زبان کو بنا سنوار رہے ہیں۔ اگر ہم اس قسم کا مواد درسی کتابوں میں کثرت سے پیش کرتے ہیں تو ہم اپنی ملت کے ساتھ دیانت دارانہ سلوک نہیں کر رہے۔ روحانی اور مادی قدروں کے امتزاج

سے ان درسی کتابوں کو اپنا بنیادی مواد حاصل کرنا ہو گا اور اس کے ڈانڈے اعلیٰ درجوں میں جا کر علمی و دینی سرمائے سے ملانے ہوں گے، ورنہ ملی تشخص ممکن نہیں ہو گا۔

۹

ثانوی اور اعلیٰ درجوں میں بھی مشرقی زبانوں کی حالت پہلے کے مقابلے میں زیادہ ابتر ہے۔ ایف اے کے پرانے نصاب میں عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں کی یہ پوزیشن تھی کہ آرٹس کے طالب علم کو ان تینوں زبانوں سے لازمی طور پر ایک زبان لینی پڑتی تھی۔ نئے نظام میں اردو کو لازمی حیثیت مل گئی ہے، اور وہ اس گروہ سے الگ ہو کر انگریزی زبان کے گروہ میں شامل ہو گئی ہے، لیکن علوم مشرقی میں دوسری زبانوں یعنی عربی اور فارسی کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا ہے، وہ ان کی پچھلی حیثیت کو بھی ختم کر دیتا ہے۔ اب آرٹس کے طالب علم کے لیے یہ ضروری نہیں رہا کہ وہ عربی فارسی زبان لیں، کیونکہ یہ دونوں زبانیں دوسری لاتعداد زبانوں اور مضامین کے گروہ میں شامل کر دی گئی ہیں جس کے باعث عربی اور فارسی کے مضامین میں طلبہ کی تعداد کم ہو گئی ہے۔

اس نئی گروہ بندی نے مشرقی علوم کی پرانی حیثیت کو بھی ختم کر دیا ہے۔ ہماری دانست میں تعلیمی کمیشن کی سفارشات واضح ہیں۔ جدید پاکستانی ذہن کی تشکیل و تعمیر کے لیے مشرقی زبانوں اور علوم کی اہمیت کو کمیشن تسلیم کرتا ہے، جس کا بظاہر مطلب یہ ہے کہ ان زبانوں کو اس سے قبل جو اہمیت حاصل تھی، کمیشن کے نزدیک ناکافی تھی اور اب ان علوم کی مزید پشت پناہی کی ضرورت ہے۔ لیکن سفارشات کی جو عملی صورت ہمارے سامنے ہے، اس میں مشرقی زبانوں کو کوئی درجہ ملنا تو کجا، ان کی پہلی حیثیت بھی ختم ہو کر رہ گئی ہے۔

نئے نصاب کی طرف آئیے تو وہ انتشار جو ابتدائی درجے کی کتابوں میں دکھائی دیتا ہے، یہاں بھی پوری قوت سے موج زن ہے۔ میٹرک اور ایف اے کے نصاب کسی حیثیت سے بھی اس قومی شعور کی خبر نہیں دیتے۔ "کاتا اور لے دوڑی" کا عمل یہاں بھی چلتا ہے۔ چھاپے خانے چھپائی میں مہینے لگاتے ہیں لیکن درسی کتابیں مرتب کرنے والوں سے ہفتے

عشرے میں کتابوں کی تیاری کی توقع کی جاتی ہے۔ اب اس بھاگ دوڑ میں اگر معیار نہیں رہتا تو نہ سہی، اگر غلطیاں راہ پا جاتی ہیں تو کوئی حرج نہیں، اگر ذخیرۂ الفاظ کی مناسب چھان پھٹک، مواد کی ترتیب اور انتخاب کا معیار برقرار نہیں رہتا تو چنداں پروا نہیں۔ انسانوں کو مشین سمجھنے اور بنانے کا یہ دفتری انداز جب سے تعلیمی حلقوں میں رائج ہوا ہے، اس کے نتائج تسلی بخش دکھائی نہیں دیتے۔ یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے۔ مجبوریاں اور معذوریاں اپنی جگہ پر ہیں لیکن پھر بھی ایک مدرس کے نقطۂ نظر سے ہر پڑھے لکھے کو یہ حق پہنچتا ہے کہ ان کتابوں کی درسی حیثیت کا جائزہ لے اور یہ دیکھے کہ یہ کتابیں کس حد تک اچھی ہیں اور پاکستانی نوجوانوں کی ذہنی تربیت کا انتظام کرتی ہیں؟ اس کا جواب ہمارے اساتذہ کے ذمے ہے۔

ان کتابوں کی سرسری ورق گردانی سے ہر پڑھنے والا چند بنیادی خامیوں سے دوچار ہوتا ہے:

۱۔ نئے نصابوں کے مرتبین کی علمی حیثیت مسلم، لیکن ان کی کتابوں میں ایسے اسباق کثیر تعداد میں موجود ہیں جو ان جماعتوں سے نچلے درجوں کے نصابوں میں پائے جاتے ہیں۔

۲۔ بعض اسباق ایران کے مڈل کے درجوں کے نصاب سے اخذ کرکے، ان میں بغیر حوالے کے داخل نصاب کر دیے گئے ہیں، حالانکہ فارسی ایرانیوں کی مادری زبان ہے اور ہمارے لیے محض کتابی یا نصابی چیز ہے۔ نیز ایرانیوں نے اپنے ذخیرۂ الفاظ کی درجہ بندی اپنی ضروریات کے مطابق کی تھی۔ ہماری ضرورتیں اور ہماری درجہ بندی ان سے مختلف ہے۔

۳۔ فارسی کی درسی کتابوں کا متن بھی ایسے افکار و خیالات پر مشتمل ہونا چاہیے تھا جو ایک پاکستانی نوجوان کی زندگی کا حصہ ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے انگریزی کتابوں میں راوی کے کنارے بیٹھ کر دریائے ٹیمز کا خواب دیکھنے کی رسم چلی تھی جسے بالآخر انگریزی کے اساتذہ نے خیرباد کہہ دیا۔ پروفیسر ایرک ڈکسن اور ان کے ساتھیوں نے ہمارے نوجوانوں کی ذہنی تربیت کے لیے جو اصول وضع کیے تھے، وہی کامیاب ہوئے۔ مشرقی زبانوں میں بھی یہی طریق کار موزوں تھا کہ فارسی اسباق ہمارے ملی احساس کی

ترجمانی کریں اور ہمارے گردو پیش سے ان کا گہرا تعلق ہو۔ ایرانی کنبے کی زندگی، ایران کے بازار اور ایرانی رسم و رواج کو موضوع بنانے سے طالب علم اپنے گردو پیش سے کٹ جاتا ہے۔

۴۔ تعلیمی کمیشن نے مادی زندگی کے ساتھ ساتھ روحانی زندگی کی ترتیب کی بھی سفارش کی ہے لیکن ان اقدار کا ہمارے کورسوں میں کہیں پتہ نہیں چلتا۔

۵۔ ذخیرۂ الفاظ کی درجہ بندی اور الفاظ و محاورات کی تکرار کا التزام بھی ان کتابوں میں نہیں ہے، حالانکہ الفاظ کی اس طرح کی نبض شناسی کے بغیر کوئی اچھے سے اچھا نصاب بھی مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔

۶۔ کتابوں کے تمہیدی اور تعارفی نوٹ بھی زیادہ محنت سے نہیں لکھے گئے۔ بعض فضلا نے اپنی پچھلی کتابوں سے پورے کے پورے ٹکڑے دوبارہ نقل کر دیے ہیں، نیز اپنے بعض معاصرین کی تحریر کو بغیر حوالے کے اپنی کتاب کا حصہ بنا لیا ہے۔ حکومت کو اس کاروبار کی طرف بھی توجہ دینی چاہیے، کیونکہ اگر یہ رجحانات پروان چڑھتے گئے تو اس سے ہماری اخلاقی قدروں پر زد پڑے گی، اور آئندہ نسل کے لیے ایسا زہر تیار ہو گا، جس کا علاج ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو جائے گا۔

۱۰

بی اے میں اب بھی مشرقی علوم کے نئے نصاب نہیں لکھے گئے اور فی الحال پرانے نصابوں سے ہی کام لیا جا رہا ہے۔ نئے نصاب کی شکل و صورت کے بارے میں بہت سے فیصلے ہو چکے ہیں، لیکن اس سلسلے میں تعلیمی حلقوں میں دو گروہ قابل ذکر ہیں جن میں سے ایک ایران گرد اصحاب کا طبقہ ہے، جس کی تعداد اگرچہ بڑی قلیل ہے لیکن وہ اپنا نقطۂ نظر بڑی گھن گرج سے دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ اس میں کچھ اصحاب ایسے ہیں جن کے خیال میں نچلے درجوں میں جدید فارسی کی کامیابی چونکہ مشکوک ہے اور اساتذہ کے جدید فارسی سے نابلد ہونے کے باعث چند برس تک یہ قابل عمل بھی نہیں، اس لیے وہ بی اے اور ایم اے کے درجوں میں کلاسیکی ادب کو خارج اور جدید ادب کو مروج کرنے کی سر توڑ کوشش کر رہے ہیں۔ اساتذہ

کا دوسرا گروہ تعداد کے لحاظ سے بڑا ہے۔ ان کے خیال میں جدید فارسی کی حیثیت نچلے طبقوں میں بڑھانے میں کوئی حرج نہیں لیکن بالائی درجوں میں تعلیمی کمیشن کی سفارشات کے مطابق مشرقی علوم اور فارسی کو پوری طرح اختیار کرنا چاہیے اور مواد کا بیشتر حصہ ان اخلاقی اور روحانی اقدار پر صرف کرنا چاہیے جن سے ہمارے نوجوانوں میں ملی شعور اور مذہبی احساس پیدا ہو۔

بی اے کے نصاب کا جو خاکہ تیار ہوا ہے اس میں بعض نئی تبدیلیاں بھی عمل میں لائی گئی ہیں۔ مثلاً ابتدا میں فارسی کے نصاب کے دو پرچے ہوتے تھے۔ ایک پرچے میں بڑا حصہ نثر کا ہوتا تھا اور دوسرے پرچے میں زیادہ توجہ نظم پر دی جاتی تھی۔ زباں دانی کی حیثیت ثانوی تھی۔ ہر طالب علم صرف کتابوں کو تیار کر کے اور فارسی زبان سیکھے بغیر امتحان میں کامیاب ہو جاتا تھا، لیکن اب صورت مختلف ہے اور نصاب سے زیادہ زور زبان سیکھنے پر دیا گیا ہے۔ یہ بات بڑی خوش آئند ہے اور اس سے طلبہ میں فارسی سیکھنے کا شوق پیدا ہو گا۔

اس چیز کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایف اے کے درجے تک زبان سیکھنے کا عمل ختم ہو جائے تو بی اے کے نصاب میں مواد پر زیادہ زور دیا جا سکتا ہے، لیکن جس طرح نیا مذہب اختیار کرنے والوں میں اپنے عقائد کے بارے میں ایک جوش و خروش پایا جاتا ہے، اسی طرح ایران کی تعلیمی فضا میں کچھ وقت گزار کر آنے والوں میں بھی بڑا جوش و خروش موجود ہے۔ وہ جدید فارسی کو بی اے اور ایم اے میں ایک عجیب و غریب راستے سے داخل کرنے میں کوشاں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ایف اے تک طالب علم بول چال کی مشق اور مضمون نویسی کا شعور نہیں رکھتے، اس لیے بی اے میں انھیں جدید فارسی سے روشناس کرانا چاہیے۔ چنانچہ نئے نصابات کی کتابوں کے جو خاکے تیار کیے گئے ہیں، ان میں جدید ایران کے جغرافیے، تہران کی مغربی وضع کی عمارتوں اور کارخانوں کے عنوانات قائم کیے جا رہے ہیں اور یہ کوشش بھی ہے کہ فارسی زبان کا زبانی امتحان بھی ہو اور اس امتحان کے لیے نمبر مخصوص کیے جائیں۔

سوال یہ ہے کہ جب کمیشن کی سفارشات کے مطابق طلبہ کو بالآخر اپنے قدیم علمی سرمائے سے آشنا ہونا ہے، تو پھر یہ زبانی امتحان پر اصرار کس وجہ سے ہو رہا ہے، اور پانچویں جماعت سے ایف اے تک پانچ برس میں طلبہ فارسی زبان پر قدرت حاصل نہیں کر سکتے ہیں

تو بی اے کے درجے پر بول چال کے لیے اس طرح کا راستہ کھولنا کیا معنی رکھتا ہے۔ نئے نظام تعلیم کے مطابق تو طلبہ کو بی اے میں آنے سے پہلے ہی زبان پر خاص قدرت ہونی چاہیے۔

فارسی کے فروغ کے لیے ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایم اے کی سطح پر فارسی زبان ہی کو قاری کے لیے بطور ذریعہ تعلیم اختیار کر لیا جائے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ صورت حال بہتر ہے اور قابل عمل بھی۔ اس میں مذکورہ بالا گروہ کے لیے ابھرنے کا موقع بھی ہے اور فارسی زبان کو اس کا جائز حق بھی مل سکتا ہے۔

۱۱

مشرقی زبانوں کے سلسلے میں ہمارا نقطۂ نظر یہ ہونا چاہیے کہ ہم جدید سے قدیم کی طرف آئیں اور اعلیٰ درجوں میں ہمارے اس علمی سرمائے کو جگہ ملنی چاہیے جو عربی اور فارسی کے کلاسیکی سرمائے میں محفوظ ہے۔ اگر ہم جدید کو کلاسیکی ادب کی جگہ دینا چاہتے ہیں تو تعلیمی لحاظ سے ہی نہیں، تعلیمی کمیشن کی رپورٹ کے مقاصد کے اعتبار سے بھی ہم غلط راستے پر پڑنے والے ہیں۔ اس وقت بی اے کی طرح ایم اے کا نصاب بھی زیر غور ہے اور اس ضمن میں بھی ارباب حل و عقد کی طرف سے تجدد پسندی کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ تجاویز، جو کسی سب کمیٹی نے مرتب کی تھیں، بعض لحاظ سے قابل غور ہیں۔ ان میں قومی مقاصد و عزائم کو جس طرح نظر انداز کیا گیا، اس کی روداد افسوسناک ہے۔ ایک ہی بورڈ جو عربی کے لیے چھ پرچوں کی سفارش کرتا ہے، وہ فارسی کے لیے آٹھ پرچے تجویز کر رہا ہے۔ آخر یہ تفاوت اور یہ تضاد کیوں؟ اس کی کوئی معقول وجہ نہیں بتائی گئی۔ فارسی کے آٹھ پرچوں کا جو خاکہ تیار ہوا، اس کی شکل و صورت کچھ اس طرح ہے:

۱۔	تاریخ ادبیات ایران	دو پرچے
۲۔	ایران کی سیاسی تاریخ	ایک پرچہ
۳۔	لسانیات	ایک پرچہ
۴۔	جدید ایرانی ادب کی تاریخ	ایک پرچہ

۵۔	بول چال کا زبانی امتحان	ایک پرچہ
۶۔	ایران کا جغرافیہ	ایک پرچہ
۷۔	کلاسیکی نظم و نثر	ایک پرچہ

یہ پہلی دفعہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ایم اے کے درجہ میں جہاں پہلے ہر پرچے میں تین تین چار چار پوری کتابیں رہی تھیں، ایک عجیب عمل شکست و ریخت کے ذریعے ان کتابوں کے صرف چند اجزا ہی باقی رہ گئے ہیں اور اب ان اجزا کی جگہ دو سو صفحات کے ایک انتخاب کی سفارش کی گئی ہے۔ ان ۵۰ نمبروں کو چھوڑ کر جو نمبر سات میں شامل ہیں، باقی پرچے بہ تمام و کمال عمومی ہیں۔ ہر طالب علم فارسی زبان سے براہ راست واقفیت پیدا کیے بغیر اردو، انگریزی اور فارسی کتابوں کی تلخیصات کی مدد سے بڑی آسانی کے ساتھ ایم اے فارسی میں اچھے نمبر لے سکے گا۔ زبان سکھانے کے لیے جہاں اور کئی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، وہاں یہ بھی لازمی ہے کہ طالب علم کے سامنے اس زبان کے چھپے ہوئے نمونے ہوں جن کا وہ لازماً مطالعہ بھی کرے۔ طالب علم اسی وقت انھیں پڑھے گا جب اس کے لیے امتحان میں نمبر بھی مخصوص ہوں گے۔ انھی کتابوں کی مدد سے وہ جملوں کے دروبست سے واقف ہو سکے گا۔ مذکورہ بالا پرچوں میں اس طرح کا تحریری مواد نہ ہونے کے برابر ہے۔

اب لے دے کے فارسی بول چال کا ایک پرچہ رہ جاتا ہے۔ زبان دانی کا مرحلہ تو ایف اے کے درجہ تک پورا ہو جانا چاہیے تھا۔ ایم اے کی منزل تک اگر جدید فارسی کو کوئی حیثیت دی جا سکتی ہے تو وہ فارسی ذریعہ تدریس کے طور پر ہی ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے محض ایک پرچے کی تخصیص ناکافی ہے۔ ایم اے فارسی اور عربی میں اگر ذریعہ تدریس و امتحان فارسی اور عربی نہیں تو پھر یہ زبانیں طالب علموں کو آئیں گی کیسے؟ اعتراض کی صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب سو نمبر کا ایک ایسا زبانی امتحان تجویز کیا جاتا ہے جس کی آزمائش ایک مختصر پیمانے پر گزشتہ چار برس سے ہو رہی ہے اور جو بالکل ناکام ثابت ہوئی۔ سلیبس میں ایک پرچے میں ۵۰ نمبر کا ایک زبانی امتحان پہلے سے شامل چلا آتا تھا۔ (تین برس پہلے اس کے نمبر ۴۰ تھے) ہمارے ہاں سیاسی اور سماجی شعبہ ہائے زندگی ہی بحران کا شکار نہیں رہے، تعلیم کے میدان میں بھی جائز اور ناجائز کی حد بندیاں ٹوٹتی رہیں۔ ان حالات میں کسی ایک فرد یا ایک دو آدمیوں کی جماعت کے ہاتھ طلبہ کی قسمت زبانی امتحان

کے طور پر دے دینا کسی طرح بھی درست قرار نہیں دیا جا سکتا۔

تجدد پسندی کا جذبہ پنجاب یونیورسٹی میں حال ہی میں صروح نہیں ہوا، ایم اے فارسی کے نصابات گزشتہ کئی برس سے بتدریج ایک خاص نہج پر ڈھالے جا رہے ہیں۔ اگر ہم ۱۹۵۰ء سے لے کر اب تک ایم اے فارسی کے نصاب میں آنے والی تبدیلیوں کا جائزہ لیں تو ان کوششوں کا حال پوری طرح واضح ہو سکتا ہے۔ ۱۹۵۰ء میں ایم اے فارسی کے چھ پرچے تھے۔ پھر سات پرچے کر دیے گئے۔ فارسی کے ساتھ اس امتیازی سلوک کی کیا ضرورت کیوں پیش آئی؟ اگر یہ طریق کار فارسی کے ساتھ مفید تھا تو اسے عربی اور دوسری زبانوں کے لیے بھی مفید ہونا چاہیے اور آزمانے کی ضرورت ہے، ورنہ جملہ مشرقی زبانوں میں یکساں سانچا ہی مناسب ہو گا۔

۱۹۵۰ء تک ایم اے کے پرچوں کی شکل و صورت یہ تھی:

- پہلا پرچہ: کلاسیکی فارسی نثر، جس میں کلاسیکی نثر کی چار کتابیں شامل تھیں۔
- دوسرا پرچہ: کلاسیکی نظم، جس میں چھ کلاسیکی شاعروں کا کلام شامل تھا۔
- تیسرا پرچہ: جس میں جدید فارسی ادب کے پہلے دور (یعنی قاچاری دور) کی نظم و نثر کی بعض کتابیں شامل تھیں۔
- چوتھا پرچہ: تاریخ ادب ایران ہخامنشی دور سے لے کر دور حاضر تک
- پانچواں پرچہ: تاریخ ایران یا اس کی جگہ لسانیات کا پرچہ
- چھٹا پرچہ: جواب مضمون (جو جدید فارسی زبان میں ہوتا تھا) یا تحقیقی مقالہ۔

پہلے تین پرچے درسی کتابوں پر مشتمل تھے اور ان میں صرف پچیس پچیس نمبر ان کتابوں پر تنقید کے لیے وقف تھے۔ گویا ۲۱۰ نمبر کی کتابیں اور باقی ۷۵ نمبر عمومی سوالوں کے لیے مخصوص تھے۔ تیسرے میں بھی ۷۰ نمبر کا متن اور ۲۵ کا تنقیدی کام تھا۔ چوتھا اور پانچواں پرچہ عمومی تھا۔ چھٹے پرچے میں جدید فارسی میں مضمون نویسی، اردو یا انگریزی سے فارسی ترجمہ وغیرہ ہوتا تھا۔

۱۲

گزشتہ برسوں کے دوران اس نظام میں بھی کچھ تبدیلیاں آئیں جو بظاہر ضمنی لیکن درحقیقت بنیادی تھیں، کیونکہ وہ ایک خاص مقصد سے رائج کی گئیں۔ پہلے پرچے میں چار کلاسیکی کتابوں کی جگہ تین کلاسیکی کتابیں اور ایک جدید فارسی کی کتاب داخل کی گئی۔ پھر چند برس کے بعد اس پرچے کی شکل یہ ہو گئی کہ دو کلاسیکی کتابیں اور دو جدید فارسی نثر کی کتابیں رکھی گئی۔ دوسرے پرچے کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ تیسرے پرچے کی کایا کلپ یوں کی گئی کہ یہ پورے کا پورا پرچہ جدید فارسی نثر کی کتابوں کی بجائے عصرِ حاضر کی جدید فارسی تاریخ ادب کا روپ دھار گیا۔ چوتھے اور پانچویں پرچے کی صورت وہی رہی۔ چھٹے پرچے میں بھی تبدیلیاں آتی رہیں۔ اس میں پہلے چالیس نمبروں کا زبانی امتحان شامل کیا گیا (جواب مضمون اور پرچے کے نمبر گھٹا کر ۶۰ کر دیے گئے)۔ پھر زبانی امتحان کے نمبر بڑھا کر ۵۰ کر دیے گئے اور اب یہ امتحان مجوزہ نصاب میں سو نمبر کا ہو گیا۔ اس کا مقابلہ موجودہ نصاب سے کیا جائے تو بعض باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً:

۱۔ موجودہ نصاب میں ۸۰۰ نمبروں میں سے متن صرف ۵۰ کا ہے (قدیم نصاب میں ۲۱۰ نمبر اس کے لیے مخصوص تھے)۔

۲۔ قدیم نصاب میں تیسرا اور چھٹا پرچہ سو سو نمبروں کے جدید ادب کے لیے مخصوص تھا۔ اس صورت حال کو ذہن میں رکھتے ہوئے اب تک کے نصاب کے سرسری جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک سوچی سمجھی پالیسی کے تحت جدید فارسی کا ایم اے میں پلہ بھاری کر دیا گیا ہے۔ کلاسیکی فارسی کو روز بروز کم کر کے بالآخر صرف ۵۰ نمبر کا رکھنے کی تجویز ہوئی ہے۔ یہ صورت حال علمی لحاظ سے خود جدید فارسی کے لیے مہلک ہے۔

۳۔ جدید فارسی کے پرچے (پرچہ نمبر ۳) میں ہر سال ایسے ادیبوں اور شاعروں کو شامل کیا جاتا ہے جنھیں ایران کی کسی بھی یونیورسٹی میں کوئی اہمیت حاصل نہیں اور نصاب کی کتابوں میں ان کی نگارشات کو کبھی درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ اگر ہم تہران یونیورسٹی کے نصاب پر سرسری نگاہ ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ وہاں بھی اعلیٰ جماعتوں

میں جدید فارسی کی حیثیت محض ذریعہ امتحان کی ہے اور مواد کے طور پر جدید کتابیں شامل نصاب نہیں۔ ادبیات میں مواد پورے کا پورا کلاسیکی مصنفین اور شاعروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ دانش کدہ ادبیات میں جو مضمون پڑھائے جاتے ہیں، ان میں پہلوی اور اوستائی گرامر، تاریخ، ادب، فلالوجی اور عربی ادب کے مضامین ہیں۔ سیاست لازمی پرچوں میں سے صرف ایک پرچہ جدید فارسی کے بارے میں ہے۔ اعلیٰ درجوں میں جا کر جدید فارسی کی حیثیت محض ایک معمولی ڈپلومے کی رہ جاتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود ایرانیوں کو یہ احساس ہے کہ جدید فارسی، کلاسیکی ادب کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ ہمارے ہاں جدید فارسی، قدیم علمی سرمائے کے بغیر اور کلاسیکی ادب سے بالکل جدا کر کے ٹھونسنے کی کوششیں کی جارہی ہیں جو کسی طرح بھی پسندیدہ نہیں۔ ایرانیوں نے تو کلاسیکی ادب کے ساتھ ساتھ عربی زبان و ادب کو بھی اعلیٰ درجوں کے طلبہ کے لیے لازمی بنا دیا تھا، لیکن ہمارے ہاں عربی تعلیم کو تو کجا، خود کلاسیکی سرمائے ہی کو خارج کرنے کا ڈول ڈالا جارہا ہے۔

۴۔ ساتویں پرچے کو لیجیے۔ جب سے یہ پرچہ جاری ہوا ہے اس وقت سے لے کر اب تک اس میں دو متبادل تھے۔ تین برس قبل اس پرچے میں یا تو شاعر مشرق حضرت علامہ اقبال کا مطالعہ خصوصی کیا جاسکتا تھا یا پھر اس کی جگہ لسانیات کا پرچہ لیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اقبال کے مقابلے میں لسانیات لینے والے طالب علموں کی تعداد بہت قلیل ہوتی تھی۔ اس سے تنگ آ کر صاحب اختیار افراد نے اقبال کے خصوصی مطالعے کی بجائے، پاک و ہند کے اکبری دور کی نثر و نظم کا جائزہ شامل نصاب کر دیا۔ طلبہ لسانیات کی جگہ اب بھی پاک و ہند کی فارسی کو پسند کرتے تھے اور وہ مقصد پورا نہیں ہو رہا تھا جس کی خاطر یہ تبدیلی کی گئی تھی۔

لسانیات پھر غیر مقبول ہی رہی۔ چنانچہ اب نئے اقدام میں (جس کی جھلک اس مقالے کے شروع میں پیش کی گئی ہے) نہ اقبال ہے اور نہ اکبری دور کا فارسی ادب ہے۔ اس کی جگہ لسانیات کو اب ایک مستقل اور لازمی پرچہ بنا دیا گیا ہے۔

اقبال کے بارے میں خود اس کے وطن میں فارسی کا کوئی پرچہ نہ ہو اور بیرونی ممالک میں ہم اقبال کے نام کی تجارت کرتے پھریں، یہ کسی طرح بھی ہماری یونیورسٹیوں کے

شایان شان نہیں۔ اس کے برعکس ایم اے اردو اور ایم اے فلسفہ میں اقبال پر ایک ایک لازمی پرچہ ہے تو پھر فارسی میں ایسا کیوں نہیں ؟

۱۳

اقبال کے علاوہ پاکستانی طلبہ کے لیے پاک و ہند کے فارسی ادب کا وہ عظیم سرمایہ، جس میں ہمارے علمی خزانے موجود ہیں، داخل نصاب کرنا چاہیے۔ اسی طرح ہمارے نصاب میں ایران کے جغرافیے اور ایران شناسی کی بجائے پاک و ہند میں فارسی ادب کی تاریخ کا موضوع زیادہ مناسب ہو گا۔

نئے نظام میں کلاسیکی ادب اور قدیم علمی سرمائے کو مناسب جگہ دیے بغیر ہم اپنی ملت کی تشکیل نہیں کر سکتے۔

ہمارا نظام تعلیم اور قومی زبان

۱

۱۹۴۷ء سے اب تک ملک میں بہت سی معاشرتی اور سیاسی تبدیلیاں آئی ہیں۔ ان تبدیلیوں کے ساتھ ہی تعلیم کے مسئلے کی نوعیت بھی تبدیل ہوتی رہی ہے۔ اس وقت جو صورت حال ہے، اس میں اردو کا مسئلہ، اردو کے ماڈل اسکول یا اردو ذریعہ تعلیم کے خاص کالج یا اردو یونیورسٹی بنانے سے حل نہ ہوگا۔ اگر ایسا ہو تو اس کی صورت بالکل وہی بنے گی جو پچھلے ۴۰ برس میں اسلامیات کی بنی ہے کہ اسلامیات کا ایک علاحدہ مضمون اور شعبہ بنانے کے نتیجے میں اسلامیات کو دیگر مضامین میں سمونے کا راستہ بڑی حد تک مسدود کر دیا گیا ہے۔ ہماری حکمت عملی اردو کے سلسلے میں اس سے مختلف ہونی چاہیے۔

۲

۱۹۴۸ء سے آج تک اردو کے کسی بھی حامی نے یہ نہیں کہا کہ انگریزی بطور ثانوی زبان کے باقی نہ رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۷۰ء تک بین الاقوامی علوم تک رسائی کا واحد

۱۹۸۵ء - انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے زیر اہتمام یکساں نظام تعلیم کے موضوع پر سیمینار میں یہ خطبہ دیا گیا۔

ذریعہ ہمارے پاس صرف انگریزی ہی تھی، البتہ ۱۹۷۰ء کے بعد سے سائنسی علوم کے سلسلے میں دنیا میں بہت زیادہ تبدیلی آ گئی ہے۔ انگریزی اب ۵۰ فی صد علوم ہم تک پہنچانے کا وسیلہ ہے، بقیہ ۵۰ فی صد علوم تو چینی، جاپانی، روسی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں کے ذریعے سے آرہے ہیں۔ اس لیے پچھلے ۲۵ برس میں انگلستان اور امریکہ میں جس کثرت سے تراجم کی انجمنیں اور ادارے قائم ہو رہے ہیں، وہ ہمارے ملک کی نسبت کہیں زیادہ ہیں۔ لیکن انگریزی کی علمی حیثیت میں اس کمی کے باوجود ہم صرف انگریزی زبان کے حامی ہیں۔ یہ درست ہے کہ بطور لازمی ثانوی زبان انگریزی ہی ہمارے لیے قابل ترجیح ہے۔ ذریعہ تعلیم کا مسئلہ اس مسئلے سے بالکل علاحدہ ہے۔ پاکستان میں عموماً ذریعہ تعلیم اور لازمی ثانوی زبان، دونوں کو آپس میں گڈمڈ کر دیا جاتا ہے۔ انگریزی تعلیم کی مدد سے ہم طلبہ کو اعداد و شمار تو دے دیتے ہیں، لیکن تعلیم حاصل کرنے والے انھیں ہضم نہیں کر پاتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم سائنس کے استاد تو بہت اچھے پیدا کر لیتے ہیں لیکن سائنس دان ایک بھی نہیں پیدا کر سکے۔ یہ صورت حال تشویش ناک ہے اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ یہ صرف قومی زبان کا حق ہے کہ اسی کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ اس سے ہم انگریزی سے محروم نہیں ہو جاتے، کیونکہ انگریزی تو لازمی ثانوی زبان کے طور پر قائم رہے گی۔ ہمارے ہاں تعلیم کا معیار گرا ہے تو وہ سیاسی اور سماجی اسباب کی بنا پر ہے، اس کا سبب قومی زبان نہیں، اردو کے مخالفین نے اسے اردو کے کھاتے میں ڈال دیا ہے۔ جب تک ہم اپنے اجتماعی نظام زندگی کو تبدیل نہیں کرتے، اردو اور انگریزی دونوں کا معیار خراب ہی رہے گا۔

۳

ہمارے دانش ور یہ سوال اکثر اٹھاتے ہیں کہ پہلے درسی کتب لائیے پھر ذریعہ تعلیم کی تبدیلی کا مطالبہ کیجیے۔ میرے نزدیک یہ مرغی اور انڈے کا مسئلہ ہے۔ رسد اور طلب ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ اگر درسی کتب کے ڈھیر بھی لگا دیے جائیں تو وہ معیاری نہیں ہو پائیں گی۔ اس لیے کہ ان کی پرکھ ہی نہ ہو سکے گی۔ معیاری کتب اس وقت تک نہیں آسکتیں جب تک باقاعدہ امتحان کی کسوٹی پر انھیں پرکھ نہ لیا جائے۔

پاکستان میں اردو کا مسئلہ کبھی بھی علمی مسئلہ نہیں سمجھا گیا۔ یہ ہمیشہ سیاسی مسئلے کے ساتھ نتھی رہا ہے۔ علمی مسئلے کو علمی سطح پر حل کیا جائے تو حل ہو سکتا ہے، اس لیے کہ علمی مسائل کے حل علمی اور سیاسی مسائل کے حل، سیاسی ہوتے ہیں۔ ہم علمی مسائل کو حل کر کے یہ سمجھ رہے ہیں کہ اس سے سیاسی مسائل بھی خود بخود حل ہو جائیں گے، یہ ممکن نہیں۔ اس کا تجربہ ہم مشرقی پاکستان میں کر چکے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں مسئلہ سیاسی اور سماجی محرومی کا تھا، جسے لسانی ذریعے سے حل کرنے کی کوشش کی گئی۔ نتیجہ مشرقی پاکستان کی علاحدگی کی صورت میں سامنے آیا اور کوئی لسانی سمجھوتہ کامیاب نہ ہو سکا۔ دوسری مثبت مثال صوبہ بلوچستان کی ہے جہاں گزشتہ عشرے میں محرومیوں کا علاج بجلی اور گیس پہنچا کر کیا گیا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ چند سال قبل بلوچستان میں جو چار زبانوں کا اختلافی مسئلہ تھا، وہ اب ختم ہو گیا ہے۔ اس لیے کہ زبان کا مسئلہ مرض نہیں ہے، مرض کی علامت ہے۔ مرض کا علاج ہوا تو مسئلہ بھی ختم ہو گیا۔

پاکستان کی صوبائی زبانوں پر لسانی سطح پر غور کیا جائے، تو یہ زبانیں اس طرح الگ الگ نہیں ہیں، جس انداز میں ایک خاص فلسفے کے تحت ان کو پیش کیا جاتا ہے۔ اگر لسانی تجزیہ کیا جائے تو ان سب زبانوں کی گرامر اور ذخیرۂ الفاظ میں مشابہت پائی جاتی ہے۔ پنجابی اور اردو کا ڈھانچہ ایک ہی طرح کا ہے۔ یہی حال دوسری صوبائی زبانوں کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے اردو کبھی نہیں پڑھی، میں نے تو فارسی بھی انگریزی ہی میں پڑھی ہے۔ لیکن مجھے اردو میں کبھی کوئی مشکل نہیں آئی۔ میرے زمانے میں تدریس کی یہی صورت ہوتی تھی کہ جب کوئی مسئلہ انگریزی میں سمجھ نہیں آتا تھا تو استاد انگریزی کی بجائے اردو یا پنجابی میں سمجھا دیتا تھا، اسی لیے ترجمے کا عمل ہمارے ذہن میں آج تک تازہ ہے۔ وہ چیز جو ہم اردو میں دس منٹ میں لکھ سکتے ہیں، وہ انگریزی میں ایک گھنٹے میں لکھ پاتے ہیں۔ بہت سے خطوط کا جواب اب دفتروں میں اسی لیے تاخیر سے دیا جاتا ہے کہ انگریزی میں جواب دینا مشکل ہوتا ہے، اور عملے کو کسی نئے جواب کا نوٹ تیار کرنے کے لیے کسی پرانی فائل کا سہارا لینا پڑتا ہے یا کئی دن لگا کر چند سطریں لکھنی پڑتی ہیں۔ مقتدرہ قومی زبان نے دفتری زبان کا تجزیہ کیا ہے، اس کے مطابق انگریزی میں صرف ۶۰۰ الفاظ ایسے ہیں جو دفتروں میں استعمال ہوتے ہیں، اسے ایک ہزار تک بڑھا لیں۔ اس کے متبادل اردو الفاظ بھی اس سے زیادہ نہیں

ہوں گے۔

۴

پاکستان میں ہماری سماجی زندگی میں کیا تبدیلی آئی ہے؟ صدر ایوب خان (۱۹۵۸ء-۱۹۶۹ء) نے سرکاری سرپرستی میں یہ کہہ کر کہ "صوبائی زبانوں کے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے" ایسی حوصلہ افزائی شروع کر دی کہ تناسب بگڑ گیا۔ اصل بات یہ تھی کہ صوبائی زبانوں کے ساتھ ظلم کوئی نہیں ہوا تھا، البتہ حوصلہ افزائی نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن ایک انتہا کا علاج دوسری انتہا سے کیا گیا۔ توازن بگڑنے سے سرکاری سرپرستی میں علاقائیت نے زور پکڑ لیا اور ہم اعتدال سے کنارہ کش ہو گئے۔ انگریزی کی حیثیت ہماری معاشرتی زندگی میں شروع ہی سے برقرار رہی ہے، لیکن ۱۹۴۷ء میں پاکستانی علاقوں میں اعلیٰ سطحوں پر اردو کی حیثیت برطانوی دور کے مقابلے میں ۵۰ فی صد گھٹا دی گئی۔ پہلے نظام تعلیم میں آرٹس کا ہر طالب علم اردو، عربی یا فارسی لیتا تھا، اب عربی فارسی تو کیا، اردو بھی اپنا پرانا مقام کھو چکی ہے۔

دوسری تبدیلی انگریزی کی حیثیت میں آئی۔ پچھلے بیس برس کے نتائج کو دیکھا جائے تو بیس برس پہلے کے سی ایس پی آفیسر وہ تھے جن کے ہاں فارسی عربی کا چرچا تھا۔ اب جو سرکاری آفیسرز آ رہے ہیں ان میں ۹۰ فی صد کے گھروں میں انگریزی بولی جاتی ہے۔ دوسرا فرق یہ ہوا ہے کہ اہم آسامیوں پر پہلے گورنمنٹ کالج لاہور کے طلبہ آ جاتے تھے یا پھر اسلامیہ کالج کے۔ دونوں کالج دو الگ الگ طبقات کی نمائندگی کرتے تھے، اب دونوں بڑی حد تک ختم ہو گئے ہیں اور اب تو ان آسامیوں پر پبلک اسکولوں کی کھیپ آنے لگی ہے۔ گویا اعلیٰ ملازمتوں تک رسائی اب صرف دولت مند طبقے کو حاصل ہے، جو انگلش میڈیم سے آ رہا ہے۔

پورے ملک میں یونیورسٹیوں میں جملہ سماجی علوم میں اردو یا انگریزی زبانوں میں جواب دینے کا اختیار ہوتا ہے۔ صوبہ سندھ میں اردو اور انگریزی کے علاوہ سندھی میں بھی جواب کا اختیار ہے۔ گزشتہ ۲۵ برس سے میں ایم اے تاریخ کے پرچے چیک کر رہا ہوں۔ شروع میں ۱۰ فی صد اردو میڈیم میں امتحان دیتے تھے، بعد میں ۵۰ فی صد تک لوگ اردو میں

جواب دینے لگے اور پچھلے آٹھ برس میں ایم اے تاریخ میں ایک بھی طالب علم نے انگریزی میں جواب نہیں دیا۔ گویا عمومی یونیورسٹیوں سے فارغ ہونے والے غریب گھرانوں کے طلبہ اردو میڈیم کے توسط سے تعلیم پا رہے ہیں اور انھیں اعلیٰ ملازمتوں میں رسائی نہیں مل رہی کہ امتحانات مقابلہ میں ذریعہ انگریزی اور صرف انگریزی ہے۔

ہماری معاشرتی زندگی میں بھی تبدیلی آ رہی ہے۔ وہ متوسط طبقہ جو سر سید احمد خان کے زمانے سے تعلیم میں دخیل رہا تھا، (ملازمتوں میں بھی اور دیگر جگہوں پر بھی)--- وہ اب ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اب ایک غریب طبقہ ہے اور ایک اونچا طبقہ ہے اور ان کے درمیان تفریق بڑھ گئی ہے۔ متوسط طبقہ تقریباً ناپید ہو چکا ہے۔ مقتدر طبقے کا مفاد اس میں ہے کہ وہ اپنے آپ کو مضبوط اور intact رکھے۔ اس کو قائم رکھنے کے لیے ملازمتوں میں انگریزی کے اشتہار اور اردو کے اشتہار کے نرخ میں بھی فرق ہے، نتیجہ یہ ہے کہ اردو اخبار اپنے اداریوں میں تو اردو کی حمایت کرتے ہیں، لیکن اشتہار چھاپنے کا وقت آتا ہے تو انگریزی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اردو اب ادنیٰ طبقے کی زبان بن گئی ہے اور انگریزی اعلیٰ کی، اس برتری کی وجہ سے نچلے طبقے کے افراد بھی بعض اوقات انگریزی ہی کو اپنانا چاہتے ہیں کہ اس میں ترقی اور اعلیٰ مقام نظر آتا ہے۔ اس ترجیح کی بڑی وجہ یہ احساس بھی ہے کہ "ہمارے ہاں سے انگریزی جائے گی نہیں"۔

۵

بعض حلقوں میں ایک اور رجحان بڑھنے لگا ہے، علاقائی زبانوں کو اردو کے خلاف ابھارا جانے لگا ہے اور یہ باور کرایا جاتا ہے کہ صوبوں کو زبان کی بنیاد پر محروم رکھا گیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ پچھلے ۲۵ برس سے ہمارے ہاں صوبائی زبانوں کی بات پر بہت زور دیا جانے لگا ہے اور برسراقتدار تعلیم یافتہ افراد نے قومی زبان کی بات کرنی چھوڑ دی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ملکی سالمیت کے خلاف بعض چیزوں پر ضرورت سے زیادہ زور دینا شروع ہو گیا ہو، اور ہم نے دوسری انتہا کو جا لیا ہو۔ اب اگر اعتدال کی راہ اختیار نہ کی گئی اور انتہا پسندی کا مناسب علاج نہ ہوا تو آٹھ، دس برس بعد طبقاتی خلیج اس قدر بڑھ جائے گی کہ پھر اسے پاٹنا ناممکن ہو

جائے گا۔

نفاذ اردو کے خلاف عام طور پر گزشتہ اٹھارہ برس کے دوران میں تین دلیلیں دی جاتی رہی ہیں:

اول یہ کہ اردو میں نصابی کتب نہیں ہیں۔ جب اردو کالج وغیرہ نے یہ کتابیں بھی مہیا کر دیں تو اب دلیل یہ ہو گئی ہے کہ اردو کتب معیاری نہیں ہیں۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ علاقائی زبانوں کو صوبائی زبانیں نہ کہا جائے۔ اس میں اہل حل وعقد کا کردار عجیب سا رہا ہے۔ پہلے ان زبانوں کو علاقائی زبانیں کہا جاتا تھا مگر بعد میں کہا گیا کہ ان زبانوں کو علاقائی کہنا، ان کی توہین ہے اور یہ سب پاکستان کی زبانیں ہیں۔ اس سے کسی کو انکار نہیں، سبھی پاکستان کی زبانیں ہیں، لیکن قومی زبان اور پاکستان کی دوسری زبانوں کے درمیان دائرہ کار کا فرق ہے۔

تیسری دلیل کے طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ سائنس کے بارے میں تو اردو کا ذکر ہی نہ کرو۔ سائنس تو انگریزی ہی میں رہنی چاہیے، ہاں اگر آپ رومن رسم الخط کو تسلیم کریں تو پھر اردو قابل قبول ہے۔

۶

گزشتہ دو برس [۸۴-۱۹۸۳ء] میں انگریزی کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے ۱۱ سیمینار منعقد ہو چکے ہیں جب کہ اردو کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے آج تک کوئی سیمینار منعقد نہیں ہوا۔ ہمیں انگریزی کے معیار کو بہتر بنانے پر اعتراض نہیں، لیکن قومی زبان کے لیے بھی تو کچھ کارروائی ہونی چاہیے تھی، جو نہیں ہو رہی۔

۷

ذریعہ تعلیم کے لیے حکومت نے تجویز کیا تھا کہ اردو ذریعہ تعلیم سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہو گا۔ پھر حکومت نے ترمیم کر کے وہ دو عملی قائم کر دی ہے، جو انگریزی ذریعہ تعلیم کے

پرائیویٹ اداروں کی صورت میں آج نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب اکثر افراد کو یہ احساس ہے کہ انگریزی بطور ذریعہ تعلیم جانے والی نہیں ہے، اس لیے اپنے اپنے بچوں کے مستقبل کو محفوظ کرنے کی صورت یہی ہے کہ انھیں انگریزی میں تعلیم دلائی جائے۔ اگر سرکاری مدرسوں میں نہیں تو پھر پرائیویٹ مدرسوں ہی میں سہی، جس کی عملاً عام اجازت نظر آتی ہے۔ انگریزی اداروں کو ہم خام مواد اس طرح بھی مہیا کرتے ہیں کہ جس سرعت سے ہمارے یہاں آبادی بڑھ رہی ہے، اس سرعت سے ہم سرکاری تعلیمی ادارے نہیں بنا رہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جہاں اچھے ادارے تھے، ان پر یہ قدغن لگا دی گئی کہ وہ اپنے داخلوں میں تعداد پر پابندی لگائیں، کیونکہ معیار گر رہا ہے۔ اس پابندی کی وجہ سے تعلیمی اداروں میں مقررہ تعداد سے زیادہ طلبہ داخل نہیں ہو سکتے۔ اب والدین بچوں کو کہاں لے جائیں؟ وہ انگریزی اسکولوں کی طرف جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ایسے متعدد اسکول ہیں جو فیس ڈیڑھ ہزار سے چار ہزار تک لے رہے ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی اپنی دیانت دارانہ کمائی سے اتنی فیس ادا نہیں کر سکتا۔ پھر فیس کہاں سے آتی ہے؟ اس کا اندازہ لگانا تو حکومت کا کام ہے۔ ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ معاشرے میں بد نظمی اور بد عنوانی زیادہ پھیلتی جا رہی ہے۔

اسلام آباد اور راولپنڈی کے انگریزی میڈیم اداروں کے سروے کے نتائج سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دو طرح کے انگریزی سکول یہاں قائم ہیں۔ اول، وہ پبلک اسکول جن کے اپنے بورڈ آف گورنرز ہیں۔ دوسرے، وہ ادارے جو نجی طور پر افراد چلا رہے ہیں۔ آج سے چھ مہینے پہلے ایسے کل چھ سو ادارے تھے (پرائمری، مڈل اور ثانوی سب سطح کے شامل ہیں)۔ ان چھ سو سے راولپنڈی کے محکمہ تعلیم کے تحت، پنجاب حکومت کے سرکلر کی بنا پر اردو میڈیم اسکولوں کے طور پر دو سو سے اوپر ادارے اب تک رجسٹرڈ ہو چکے ہیں۔ یہ وہ ادارے ہیں جن میں اردو لازمی مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی ہے، اس لیے وہ اردو میڈیم ادارے قرار پائے ہیں۔ خواہ باقی تمام کارروائی انگریزی ہی میں ہوتی ہو۔ انگلش میڈیم اداروں کے اس سروے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آئندہ چھ ماہ میں کیا پوزیشن ہو گی؟ انگریزی میڈیم اسکولوں کے مقبول ہونے کے کیا اسباب ہیں، اس کا سائنٹفک تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔

۸

گزشتہ چند برس سے بعض سیاست دانوں کے اس رجحان پر بھی غور کیجیے کہ وہ صوبے کا نام لیتے ہوئے صوبے کا لفظ ساتھ نہیں لگاتے۔ صوبہ بلوچستان کا ذکر ہوگا تو صرف بلوچستان کہا جائے گا۔ صوبہ سندھ کی بات ہوگی تو صرف سندھ کہا جائے گا۔ اسی طرح صوبہ پنجاب اور سرحد کو صرف پنجاب اور سرحد کہا جاتا ہے، صوبہ پنجاب، صوبہ سرحد نہیں کہا جائے گا۔ اس کی implications پر غور کریں تو بڑی بھیانک صورت سامنے آتی ہے۔

۹

اب وقت آگیا ہے کہ ہمیں تعلیم میں اپنی ترجیحات پر از سر نو غور کرنا چاہیے۔ نصاب تعلیم پر بھی غور ہونا چاہیے اور حقیقت تو یہ ہے کہ نصاب بنالینا ہی کافی نہیں ہے۔ آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ ایک زمانے میں پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ میں ایک کتاب چلتی رہی ہے۔ ۱۳ برس تک چھٹی جماعت کی اس کتاب میں قائد اعظم کے بارے میں جو مضمون پڑھایا جاتا رہا، اس کا آخری جملہ تھا، "اور افسوس پاکستان بن گیا"۔

آپ لاکھ نصاب صحیح بنالیں، بیکار ہوں گے۔ لکھنے والے کے نقطۂ نظر پر بھی توجہ دینی چاہیے۔ مختلف عمومی موضوعات پر ہمیشہ بہت دلچسپ اسباق آپ کو کتب میں مل جائیں گے لیکن پاکستان کے بارے میں درسی کتب کے اسباق دیکھیں تو اکثر وہ مؤلف نظر آئیں گے جن کا دو قومی نظریے پر ہی یقین نہیں۔ اس لیے آپ دیکھ رہے ہیں کہ اسلام، پاکستان اور قائد اعظم کے بارے میں کتابوں میں درج مضامین عموماً نشاط انگیز اور روح پرور نہیں ہوتے۔ اسی طرح اسلام کے بارے میں ایک آسان گر درسی موضوعات پر لکھنے والوں نے ڈھونڈ لیا ہے کہ جو کچھ پانچویں جماعت میں پڑھایا جائے، من و عن اسے ایف اے اور بی اے تک دہرایا جائے۔ نتیجہ یہ کہ دو سال ہی میں طالب علم ان مضامین سے بے زار ہو جاتا ہے۔ پاکستان اور اسلام کے بارے میں درسی کتابوں کے اس رجحان کی روک تھام ضروری ہے، کیونکہ ہمارا تعلیمی نظام پہلے کے مقابلے میں زیادہ انتشار اور ابتری کا شکار ہو گیا ہے، اور

اگر اس پر توجہ نہ کی گئی تو حالات اور زیادہ خراب ہو جائیں گے اور لسانی حوالے سے سامنے آنے والی طبقاتی کش مکش کو ہم تیز تر کرنے کا سبب بن جائیں گے۔

نظام امتحانات اور معیار تعلیم

ہمارے ہاں تعلیمی زوال کو عام طور پر نظام تعلیم اور نظام امتحان کے ڈھانچے سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تعلیمی نظام میں نصابات اور طریق امتحان دونوں کی اہمیت ہے، لیکن یہ قطعی اور آخری نہیں۔ اس لیے کہ زندگی کے مختلف سیاسی، سماجی اور اقتصادی عوامل اس طرح ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں کہ اس سے تعلیمی معیار کسی ایک عنصر کو صحیح تناظر میں پیش نہیں کر سکتا۔

یہ رواج سا ہو گیا ہے کہ ہم ساری خرابی کو یا تو درسی کتابوں تک محدود کر دیتے ہیں، یا تدریس سے متعلق ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یا پھر خرابی کی پوری ذمہ داری نظام امتحان پر ڈال دیتے ہیں۔ ایک اور طریقہ بھی ہے کہ ہر خرابی کو سابقہ نو آبادیاتی نظام کے سر ڈال دیا جائے۔ اگر صرف اتنی ہی بات تھی تو طریق امتحانات اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے کیوں صحیح تھے اور آج کیوں درست نہیں؟

یہ صحیح ہے کہ خرابی کی جڑیں سیاسی، سماجی اور اقتصادی عوامل میں پیوست ہیں۔ ہماری قدروں میں زوال کے آثار پاکستان بننے کے بعد پیدا ہوئے۔ اس زوال نے نظام تعلیم اور نظام امتحانات کو خراب کر دیا۔ معاشرے میں اگر جرائم کی بھرمار ہو گی تو امتحان دینے کے

ستمبر ۱۹۹۰ء۔ "پاکستان میں نظام امتحانات: بحران، اسباب، حل" کے موضوع پر انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز۔ اسلام آباد کے سیمینار میں صدارتی خطبہ۔

عمل میں بھی یہ "جرائم پیشگی" نمودار ہو گی۔ خراب معاشرہ اچھے سے اچھے امتحانی سانچے کو خراب کر دیتا ہے۔ اسی لیے جب اصلاح کی بات کی جاتی ہے تو تنہا نظام امتحانات کو درست کرنے یا تنہا نصاب کو ٹھیک کرنے یا تنہا استاد کے نیک ہونے سے زندگی کے جملہ انداز درست نہیں ہو پائیں گے۔ معاشرہ بگڑ چکا ہو تو اچھے اقدام بھی برے نتائج پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔

ملازمتوں کے حصول میں سفارشوں کو ختم کرنے کے لیے صوبہ پنجاب کی حکومت نے طے کیا کہ پیشہ وارانہ کالجوں اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں داخلہ صرف میرٹ پر ہو گا۔ اس کے نتیجے میں میٹرک اور ایف اے / ایف ایس سی کے امتحانی مراکز اور ممتحن حضرات سارے معاشرے کی تگ و دو کا محور بن گئے، امتحانوں میں نقل کا رجحان بڑھا اور ممتحن حضرات تک پہنچنے کے نئے نئے طریقے دریافت ہوئے، حتیٰ کہ اسے باقاعدہ ایک صنعت کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

صرف لاہور کو لیجیے! یہاں بعض اداروں نے اپنے مالی مفادات کے تحفظ کے لیے ایسی سرگرمیوں کو منظم کیا۔ جو طالب علم امتحان دینا چاہتا ہے، اگر وہ صرف اس ممتحن کا نام اور پتہ معلوم کرنا چاہتا ہے جس کے پاس اس کا پرچہ گیا ہے، تو اس کا نرخ معین ہے اگر یہ کام بھی خود ادارے کو انجام دینا ہے تو نرخ دوگنا ہے۔ پرچوں کی تقسیم کا نظام خفیہ ہے۔ تمام احتیاطوں کے باوجود ایک آخری صورت تو ترسیل ڈاک کا نظام ہو سکتی ہے یا بورڈوں کے دفاتر۔ ممتحنوں کو بھیجے گئے میمو (memos) کی فوٹو کاپیاں حاصل کرنا کوئی ناممکن تو نہیں۔ اگر ڈاک خانہ "تعاون" نہیں کرتا تو بورڈوں کا دفتری عملہ یا دوسرے کارکن تو مددگار ہو سکتے ہیں، جن سے پرچہ آسانی کے ساتھ شناخت کیا جا سکے۔

پوزیشن حاصل کرنے کے لیے ایم اے کے امتحانات میں نمبروں کا آخری فیصلہ تحقیقی مقالے کی مدد سے ہوتا ہے۔ تحقیقی مقالے کی جانچ کو بوجوہ نتیجہ نکلنے تک روکا جا سکتا ہے اور اس کے بعد آسانی سے اس کا فیصلہ ہو سکتا ہے کہ کس طالب علم کو تحقیقی مقالے میں کتنے نمبر دے کر اسے مقررہ میرٹ تک لے جایا جا سکتا ہے۔

اصل چیز امتحانی طریقہ کار نہیں، وہ معیار اخلاق ہے جو ہماری درس گاہوں اور امتحانی مراکز سے رخصت ہو گیا ہے۔ آپ اپنی مرضی کا سنٹر بھی پانچ سو، ہزار روپے دے کر مقرر

کرواسکتے ہیں۔ سنا ہے، امتحانی سنٹر بھی فروخت ہوتے ہیں۔

آخر کیا سبب ہے کہ اسی پرانے نظام تعلیم سے علامہ اقبال اور بعض دوسرے اکابر، کامیابی کی بلندیوں تک پہنچے اور ہم معیار تعلیم کو پست سے پست تر کرنے کا سبب بن رہے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ نظام امتحانات کی درستی اپنی جگہ، لیکن نظام اخلاق کی درستی بھی اسی نسبت سے بہت زیادہ ضروری ہے۔

کہا جاتا ہے کہ پرانا نظام تعلیم نو آبادیاتی نظام کا نتیجہ تھا، اس لیے اس کی جگہ ہم نے سمسٹر کا نظام رائج کیا۔ لیکن اس سے امتحانی نتائج ایک اعلیٰ سطح کا کاروبار بن گئے۔ امتحانی سنٹروں میں اگر استاد کو پستول کی نوک پر خاموش کیا جاسکتا ہے تو کلاس کو درس دینے والے استاد کو بھی بہ نوک خنجر خاموش کیا جا سکتا ہے۔ خرابی جو غائبانہ امتحان دینے میں تھی آمنے سامنے آکر اور زیادہ بھیانک ہو گئی ہے۔ بعض یونیورسٹیوں میں مسابقت کے پیش نظر کہ صوبائی کوٹے میں ان کا حصہ کم نہ ہو جائے، اپنے طالب علموں کو زیادہ سے زیادہ نمبر دینے کا رجحان غالب آتا جارہا ہے۔ صوبائی آویزش نے اس عنصر کو اور زیادہ تقویت دی ہے۔

کیا وجہ ہے کہ مقابلے کے امتحان میں اور پبلک سروس کمیشن کے امتحان اور کمیشن کے انٹرویو میں پرانے سیکنڈ ڈویژن لینے والے زیادہ کامیاب ہوتے ہیں اور اعلیٰ نمبروں والے رہ جاتے ہیں۔ خرابی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ پبلک سروس کمیشنوں کے ڈھانچے بدل چکے ہیں اور انھیں حکومتی عملے کے ذیلی ادارے بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ ان میں سے بھی بعض اراکین اب آزادانہ طور پر سرکاری دباؤ کے بغیر فیصلہ نہیں کرسکتے۔

نظام امتحانات کی خرابی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ پہلے کالج اور یونیورسٹی کی سطح تک آزمائشی امتحانات ہوتے تھے۔ لیکن اب بیشتر اداروں میں یہ نظام عملاً ختم ہو چکا ہے اور جہاں ہے، وہاں نتائج کا معیار کسی قدر بہتر رہتا ہے اور ان اداروں کے اپنے امتحانی نتائج اور بورڈوں اور یونیورسٹیوں کے امتحانی نتائج کے درمیانی تفاوت کم تر رہتا ہے۔

استاد بھی استاد کے بجائے ٹریڈ یونینسٹ ہو چکے ہیں۔ پڑھائی کی بجائے نمبروں کے حصول کی تگ و دو اور احتجاج کے ذرائع زیادہ کامیاب سمجھے جاتے ہیں۔

تقسیم برصغیر کے بعد جب تعلیم میں مسلمان اساتذہ کی تعداد تھوڑی رہ گئی تو معیار ملازمت کو گھٹا کر تیسرے درجے کے استادوں کی بھی بھرتی کی گئی۔ پہلے یونیورسٹیوں میں

استاد، مفصل کالجوں کی دس بیس سال مار کھانے کے بعد آتے تھے، اب نا تجربہ کار استاد براہ راست یونیورسٹیوں میں آ گئے ہیں، جو طالب علموں کے ساتھ دوستیاں قائم کر کے اور ان کے مشاغل میں شریک ہو کر، کلاسوں پر اپنا ڈسپلن قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح قیام پاکستان سے لے کر اب تک استاد کا پیشہ اپنی حرمت کھو چکا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جسے کوئی اور نوکری نہیں ملتی، وہ محکمہ تعلیم کا سہارا لیتا ہے۔ جو اچھے استاد آتے بھی ہیں، وہ دو چار برس میں مقابلے کا امتحان CSS پاس کر کے یا بنکوں میں ملازمت اختیار کر کے تعلیم کے پیشے سے نکل جاتے ہیں۔ گویا یہ پیشہ محض آگے بڑھنے اور قدم جما کر دوسرے میدانوں میں نکل جانے کا وسیلہ بن گیا ہے۔

پہلے نجی ادارے حکومت کی براہ راست تحویل میں نہیں تھے۔ اکثر ادارے، بعض انجمنیں چلاتی تھیں اور یہ کام کار خیر سمجھ کر کیا جاتا تھا۔ جو استاد ان اداروں میں پڑھاتے تھے، وہ اپنی مزید ترقی کے لیے بھی مقابلے اور مسابقے کو پیش نظر رکھتے تھے۔ تعلیم ان کے نزدیک زیادہ تر فقر اور درویشی کا انعام تھی، آخرت کو درست کرنے کا وسیلہ تھی۔ وہ طالب علموں پر کالج کے اوقات کے بعد بھی محنت کرتے تھے۔ جب یہی ادارے سرکاری تحویل میں چلے گئے تو تدریس محض ملازمت قرار پائی اور معیار بڑی تیزی سے گرنا شروع ہو گیا اور حکومت اتنے اداروں کے کام کو اچھی طرح سنبھال نہ سکی، اس کی توقع بھی نہ کی جا سکتی تھی۔ ہم اشتراکی ہتھکنڈوں کی چکا چوند سے مرعوب ہوئے اور اپنے تعلیمی اداروں کو قومیا کر معیار تعلیم کو گرانے کا سبب بنے، کیونکہ تعلیم کو درویش اساتذہ اور مخیر حضرات کی گرفت سے نکال کر ہم نے عملاً بیورو کریٹس کے حوالے کر دیا۔

آج کل جو نجی تعلیمی ادارے تیزی سے ابھرے ہیں، وہ تجارتی بنیادوں پر استوار ہیں۔ یہ ادارے بلا مبالغہ صنعتیں ہیں اور ظاہر ہے کہ صنعتوں کی ترقی اس وقت ممکن ہے، جب آپ اپنے مال کی زیادہ سے زیادہ کھپت کی ضمانت دے سکیں۔

معاشرتی طور پر نظام امتحانات ثانوی مسئلہ ہو گیا ہے۔ سمسٹر ہو، سالانہ امتحان یا دو سالہ امتحان کا طریق کار ہو، یہ مسائل اب ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں خرابیاں اس وقت در آتی ہیں، جب معاشرتی زندگی صحیح انداز سے نشوونما نہ پا رہی ہو۔

معیار تعلیم کے زوال میں نظام امتحان کا دخل دوسرے عناصر کی نسبت کسی قدر کم

ہے۔ تاہم معیار تعلیم نظام امتحانات کی وجہ سے بھی گرا ہے، لیکن یہ واحد سبب نہیں، بنیادی اسباب کچھ اور بھی ہیں۔

آیا نظام امتحانات کو موثر بنانے کے لیے کوئی تادیبی عمل کار گر ہو گا یا نہیں؟ اس کا جواب میری دانست میں بڑی حد تک نفی میں ہے۔ جب معاشرتی ڈھانچہ ایسا بن جائے کہ جرم کرنے والا اور بے قصور دونوں ایک ہی ترازو میں تل رہے ہوں اور جب قانون کو نافذ کرنے والے ادارے اپنے آپ کو دباؤ میں محسوس کرتے ہوں، یا نفاذ قانون میں بے بس ہو جائیں تو تادیبی کارروائی کے لیے قائم ہو جانے والی کمیٹیاں بھی اپنے فرائض نیک نیتی اور دیانت داری سے انجام نہیں دے سکتیں۔ قانون کا احترام تو ایک بھرم پر قائم رہتا ہے، جب وہ بھرم نہ رہے تو اچھے سے اچھا قانون نافذ العمل نہیں رہتا۔ نظام امتحانات کی گرتی ہوئی ساکھ کو نئی بنیادوں پر استوار کر کے کسی حد تک بچایا جا سکتا ہے، لیکن جب تک اصل خرابی کا سد باب نہیں ہو گا، یہ جزوی تبدیلیاں پوری طرح مفید ثابت نہیں ہو سکتیں۔

نظام امتحانات اور معیار تعلیم صرف ایک واسطے سے آپس میں مربوط ہیں اور وہ دیانت دارانہ انعقاد امتحانات ہے۔ معیار تعلیم کی اصل اور بنیادی جڑیں شعبہ تدریس، نصاب تدریس اور کاپیوں کی جانچ پڑتال کے علاوہ ایک بڑی حد تک اس اخلاقی ڈھانچے پر منحصر ہیں، جو ہمارے ہاں بہت حد تک برباد ہو چکا ہے۔ اچھا معاشرہ ہی اچھے استاد پیدا کر سکتا ہے۔ اچھا معاشرہ ہی اچھے ممتحن اور اچھے نگران امتحانات پیدا کر سکتا ہے۔ اس کے بغیر جو اصلاح بھی ہو گی، وہ جزوی ہو گی اور اس کے اثرات بھی عارضی ہوں گے۔ ان اقدامات سے امتحانات کی پوری دنیا ٹھیک نہیں ہو سکتی۔

امتحانوں کے نگران مقرر کرنے کا نظام بہتر بنانے کی بھی ضرورت ہے۔ صاحب اخلاق اساتذہ کو اس سلسلے میں آگے جانا چاہیے، لیکن معاشرے اور حکومت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ان لوگوں کو پورا تحفظ دیا جائے اور اس بات کی ضمانت بھی ہو کہ کمرہ امتحان کے باہر بھی ان کی عزت نفس محفوظ رہے گی۔

ہمارے ہاں جتنے تعلیمی کمیشن بیٹھے ہیں، ان کا دعویٰ یہ تھا کہ انھوں نے چور پکڑ لیا ہے اور وہ چور استاد ہے۔ یٰنی معاشرے کی ساری سیاہ کاریوں کا نشانہ استاد کو بنایا گیا۔ معاشرے کی ساری کالک استاد کے منہ پر مل دی گئی۔ جس سے اس کا وقار بھی مجروح ہوا اور

اسے دوسرے ذرائع کا سہارا لینا پڑا۔ یہ صورت حال تشویش ناک بھی ہے اور افسوس ناک بھی۔ لیکن یہ ایک بڑا سوالیہ نشان ہے کہ اصلاح کہاں سے شروع ہو؟ زندگی کا کون سا شعبہ ایسا ہے جہاں سے اصلاح کا آغاز کیا جائے؟

اصلاح کا عمل فرد کی ذات سے شروع ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے نہ تو کوئی دستخط کرنے سے بنا بنایا ضابطہ اخلاق نافذ ہو گا اور نہ امتحانوں کے نگرانوں سے حلف نامہ لے کر نیک نیتی کو بحال کیا جاسکتا ہے۔ اصلاح کی ابتدا تو ہر فرد کو اپنے آپ سے کرنا ہو گی۔

باقی رہے نظام امتحانات یا نظام تدریس یا دوسرے طریقہ ہائے کار، ان کی مدد سے صرف جزوی اصلاح ہی ممکن ہے، اور وہ بھی اس وقت جب قانون کا بھرم قائم ہو۔ عام حالات میں ۱۰ پولیس کے سپاہی سو دیہاتیوں اور شہریوں میں امن بحال رکھ سکتے ہیں، لیکن یہ بھرم نہ رہے تو پھر پولیس اسٹیشن بھی بکاؤ مال بن جاتے ہیں اور امتحانی مراکز بھی قابل فروخت چیز ہو جاتے ہیں۔ یہ کہہ کر میں نگران کی ذمہ داری کو نظر انداز نہیں کر رہا، وہ اپنی جگہ پر ہے، لیکن ہر آدمی کو بہتر فضا مہیا کرنے کے لیے آس پاس کا جھاڑ جھنکار صاف کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ پنجابی فلموں کی طرح بھی نہیں ہو گا، جن میں یہ کہا جاتا ہے کہ "جج صاحب! سزا صرف اس معاشرے کو دیجیے جس نے طوائف کو طوائف اور ڈاکو کو ڈاکو بنایا ہے"۔ میں اس طرح نظام امتحان میں شامل افراد کو بری الذمہ قرار نہیں دیتا، نہ یہ حقیقت پسندانہ طرز عمل ہو گا۔ خرابیاں ان میں بھی ہیں، لیکن ان کو اچھا ماحول دیجیے تا کہ ان کی زیادہ تعداد نیک ہو جائے۔

نظام امتحان میں استاد، والدین، ممتحن، نگران اور طالب علم برابر کے شریک ہیں، کوئی ایک اصلاح جو کسی ایک سیکٹر سے کی جائے گی، ادھوری ہو گی۔ اچھے نتائج پیدا کرنے کے لیے سب کو اچھا بننا ہو گا۔ کیونکہ اصل خرابی تعلیمی نظام کی نہیں، معاشرے کی ہے جسے ٹھیک کیے بغیر کوئی تادیبی عمل اور نظام امتحان کا کوئی سانچہ کامیابی سے نہیں چل سکتا۔

تجاویز

مختصر طور پر ان گزارشات کا مطلب یہ ہے کہ نظام امتحان درست کرنے سے معاشرے کی اصلاح کا کام محدود طور پر ہی ممکن ہے۔ اس کی درستی کے لیے چند تجاویز پیش کی

جاتی ہیں:

۱۔ فی الوقت ملک میں کئی نظام ہائے امتحان چل رہے ہیں، جن میں سالانہ بیرونی امتحان اور سمسٹر نظام متوازی ہیں، جنھیں اسکول اور کالج سے الگ، مستقل ادارے لیتے ہیں۔ اس دو غلے نظام کی بجائے ایک نظام رائج کیا جائے یا سابقہ طریقہ امتحان رائج کیا جائے یا سمسٹر نظام کو کلی طور پر اپنایا جائے۔ دو غلے نظام سے معاشرے میں کئی خرابیاں جڑ پکڑ رہی ہیں۔

۲۔ سال میں دو دو امتحان (پارٹ اول اور پارٹ دوم) ختم کر دیے جائیں اور اس طرح امتحانات کی تعداد بھی (ملکی حالت کے پیش نظر) محدود کر دی جائے۔ صرف پنجاب یونیورسٹی میں اس وقت ڈگری اور ڈپلوما امتحانات کی تعداد ۲۹۰ سے اوپر جا چکی ہے۔

۳۔ اکثر امتحانی اداروں کا عملہ ان کی ضرورت سے دگنا ہے۔ اگر کم اسٹاف سے مستعدی پر اثر پڑتا ہے تو زیادہ عملے سے بھی کارکردگی متاثر ہوتی ہے۔ اس لیے امتحانی اداروں کے عملے کا ازسر نو جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

۴۔ امتحانات پر مقرر نگرانوں (سپرنٹنڈنٹ، نائب سپرنٹنڈنٹ اور دیگر اہل کار) کو ہر سال ایک ہی سنٹر پر تعینات نہ کیا جائے، بلکہ سنٹر بدلتے رہیں تو مناسب ہے۔

۵۔ امتحانی محکموں کے کارکن سالہا سال تک ایک ہی نشست (seat) پر متمکن نہ رہیں۔ ان کے داخلی (internal) تبادلے بھی دوسرے تیسرے سال ہوں، نیز اپنے صیغے سے باہر انتظامی (adminstrative) اسامیوں پر بھی تعینات کیے جائیں۔ اس طرح نیا خون داخل ہوتا رہے گا۔ یہ فارمولا اختیار کیا جائے کہ ہر سال ایک تہائی عملہ ٹرانسفر ہو اور نئے افراد ان کی جگہ لے لیں۔

۶۔ نگران عملہ امتحانات کا تقرر ایسی کمیٹیوں کے سپرد ہو، جن میں امتحانی عملہ بطور رکن شامل نہ ہو۔

۷۔ شعبہ امتحانات کے ناظمین اعلیٰ (کنٹرولر امتحانات) کو ان اداروں کا رکن بنانے سے بھی اجتناب کیا جائے، جن کے ہاتھ میں ادارۂ امتحان کی کارکردگی کا جائزہ اور محاسبے کا اختیار ہو۔

۸۔ ناجائزہ ذرائع امتحانات کی روک تھام کے لیے بنائی گئی کمیٹیوں کی رکنیت میں، امتحانی

عملے کا سربراہ شامل نہ کیا جائے۔ اس کا کام صرف ریکارڈ پیش کرنے اور وضاحتوں کا جواب دینے تک محدود کر دیا جائے، تاکہ وہ امتحانی فیصلوں پر اثر انداز نہ ہو سکے۔

۹۔ فیل ہونے والے طلبہ کی کاپیاں جانچتے وقت، ان طلبہ یا ان کے والدین یا سرپرستوں کو کاپی دکھانے کی اجازت ہونی چاہیے۔ نیز ممتحنوں کی نمبر کاری کو چیلنج کرنے کا قانونی حق بھی دوبارہ بحال ہونا چاہیے۔ موجودہ صورت میں یہ معاملے محض نمبروں کی میزان چیک کرنے تک محدود ہو گئے ہیں۔

۱۰۔ صوبائی اور وفاقی پبلک سروس کمشنوں کو انتظامیہ کے اثر سے مکمل طور پر آزاد کر دیا جائے۔

امدادی کتب کا مسئلہ

"قومی تعلیمی کمیشن" نے درسی کتب کی شرحوں پر پابندی لگانے کی سفارش کی ہے۔ اس کی رائے میں ایسی تمام کتابیں قابل ضبطی ہیں، کیونکہ ہمارے تعلیمی معیار کی پستی کے جہاں اور کئی اسباب ہیں، ان میں ایک سبب یہ بھی ہے کہ طلبہ کتب کا خود بغور مطالعہ کرنے کی عادت رفتہ رفتہ ترک کرتے جا رہے ہیں، اور بازاری نوٹ انھیں بعض سہل راستے دکھا کر علم کے صحیح مقاصد سے دور لے جاتے ہیں۔ ان بازاری نوٹوں میں طلبہ کے لیے سوالاً جواباً بنا بنایا مواد ہوتا ہے اور نصاب کے امتحانی نقطۂ نظر سے بعض اہم حصوں کو پیش کر دیا جاتا ہے تاکہ طالب علم اصل کتاب پڑھنے کے جھنجھٹ سے بچ جائے اور محض اسی نوٹ یا خلاصے کو رٹ کر پاس ہو جائے۔ اس spoon feeding کا نتیجہ وہ تعلیمی پستی ہے، جس کا ہم شکار ہو رہے ہیں۔ حکومت نے اس نقصان کی تلافی یوں کی ہے کہ نوٹوں کو یک قلم جرم قرار دے دیا ہے تاکہ اس طرح کی کتب کی اشاعت بند ہو جائے اور اساتذہ اور طالب علم اصل نصاب کی طرف رجوع کریں اور علمی سطح بلند ہو سکے۔

"نوٹ سازی" کی وبائے عام یوں تو ہمارے درسی پروگرام پر مدت سے اثر انداز ہے۔ اور ایسے کئی ادارے بھی ہیں جن میں ہر طالب علم کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ درسی کتاب کے ساتھ ساتھ اپنے کالج کے استاد یا اپنے ہیڈ ماسٹر کا تیار کردہ نوٹ بھی حکماً

۴ ستمبر ۱۹۶۲ء۔ "قومی تعلیمی کمیشن" کی سفارشات منظر عام پر آنے پر یہ مضمون لکھا گیا۔

خریدتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایسے نوٹ پر عموماً لکھنے والے کے نام کی جگہ کوئی فرضی نام دیا جاتا ہے۔ یہ تجارت تقسیم برصغیر سے پیشتر خال خال تھی، اس کے بعد عام ہو گئی۔ پہلے اساتذہ محض جلب زر کے شائق نہ تھے، بلکہ اپنے پیشے کی ذمہ داریوں سے بھی آگاہ تھے۔ چنانچہ ایسے نوٹوں میں "کاتا اور لے دوڑی" کا مسلک نہ تھا، بلکہ یہ خلاصے محنت سے تیار کیے جاتے تھے۔ تقسیم برصغیر کے بعد جہاں قومی زندگی کے دوسرے شعبوں میں بدنیتی، سہل انگاری اور فرض ناشناسی کی وبا عام ہوئی، وہاں درس گاہیں بھی ان رجحانات سے اثر پذیر ہونے بغیر نہ رہ سکیں، اگرچہ سبھی اساتذہ اس کا شکار نہیں لیکن اکثریت اس ڈگر پر چلنے لگی ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں نے شرحوں میں اپنے قائم کردہ معیار میں بھی خرابی پیدا کر دی۔ ایک تو ویسے ہی سوالاً جواباً لکھی ہوئی کتابیں طلبہ کی ذہنی صلاحیتوں کو سکون کی نیند سلانے میں کیا کم تھیں کہ اب ان کتب میں واقعات کی صحت، عبارت کی درستی اور مواد کی ترتیب کو بھی نظر انداز کیا جانے لگا۔ غرض کہ ہر پہلو سے آسانی کی راہیں نکالی گئیں۔ جہاں نصاب کی کتابوں میں پرائے مال پر بے دریغ ہاتھ صاف کیا جانے لگا، وہاں ایسی شرحوں میں بے شمار اغلاط اور مضحکہ خیز مطالب کی بھرمار بھی ہوئی۔ نام گنانے کی ضرورت نہیں، بازار میں ایسے خلاصے اب بھی فروخت ہوتے ہیں جن میں یہ خامیاں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ صرف اردو اور فارسی ہی کو لیا جائے تو یہاں بھی لال بجھکڑوں کی کمی نہیں۔ اب حال یہ ہے کہ یونیورسٹیوں کے استاد بھی درسی کتابوں کے خلاصے لکھنے میں اپنی عمر ضائع کرتے ہیں۔ یہ کام کبھی اپنے نام سے کیے جاتے ہیں اور کبھی فرضی ناموں سے --- وبائے عام میں مرنا تو برحق، لیکن اپنی کرسی کا احترام تو واجب ہے۔ اس میں دو چار پردہ نشینوں کے نام بھی آتے ہیں، اس لیے اس طبقے کو چھوڑیے۔

اسکولوں میں بھی یہی کام بڑے وسیع پیمانے پر ہو رہا ہے اور وہاں بھی تعلیمی لال بجھکڑوں کی کمی نہیں۔

اردو ہی کو لیجیے۔ سرمایہ اردو (مرتبہ: حافظ محمود شیرانی) مدت سے میٹرک میں شاملِ نصاب رہی۔ اس میں سودا کا مشہور "شہر آشوب" شامل ہے۔ یوں تو تمام نظم شارحین کی بوالعجبیوں کی عمدہ مثال ہے، لیکن یہ دو بند خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں:

نہ صرف خاص میں آمد نہ خالصہ جاری
اب آگے دفتر تن کی میں کیا کہوں خواری
سپاہی تا متصدی سبھوں کو بیکاری
سوال دستخطی پھاڑ کر کے پنساری

کسی کو آنولہ دے باندھ کر کسی کو کٹول

کروں معاش کا حضرت کی تجھ سے کیا میں بیاں
کہ توشہ خانہ ہے ان کا پراپچے کی دکاں
نکل تنور کے منہ سے کھے ہے گاؤ زباں
بکی ہوں تب میں کہ جب کاتبی ہو خلد مکاں

بکی ہے تیسرے فاقے میں کوڑیوں کے مول

پہلے صاحب فرماتے ہیں:

صرفِ خاص: شاہی خرچ، نواب یا بادشاہ کا خرچ۔ آمد: آمدنی۔ خالصہ: خالص آمدنی۔ دفتر تن: بدن کا دفتر۔ دفتر تن کی خواری کیا کہوں: بدن بڑی تکلیف میں ہے۔

مطلب: اب نہ امیروں کو اپنی ذاتی جائیداد سے آمدنی ہے اور نہ ریاست سے روپیہ ملتا ہے۔ سپاہی منشی سب بے کار ہیں۔ بلکہ آدمی سخت ذلیل ہو رہے ہیں۔ اب دستخط والی عرضیاں ردی ہیں اور ان میں پنساری دواؤں کی پڑیا بیچ رہے ہیں۔ ان کی قدر کچھ نہیں۔ نوکری کی عرضی فضول اور بیکار ہے۔ (رہنمائے اردو، حصہ نظم ص ۴)

دوسرے صاحب نے ارشاد فرمایا ہے:

صرف خاص: شاہی خرچ۔ خالصہ: خالص آمدنی۔ دفتر تن: بدن کا دفتر یعنی بدن۔

دفترتن کی خواری کیا کہوں؛ بدن بڑی تکلیف میں ہے۔
مطلب: اب نہ امیروں کو کو اپنی ذاتی جائداد سے آمدنی ہے اور نہ ریاست سے روپیہ ملتا ہے۔ سپاہی منشی سب بے کار ہیں۔ بدن (آدمی) سخت ذلیل ہو رہے ہیں۔ اب دستخط والی عرضیاں بھی ردی ہیں اور ان میں پنساری دواؤں کی پڑیا بیچ رہے ہیں۔ ان کی کچھ قدر نہیں۔ نوکری کی عرضی فضول اور بیکار ہے"۔

(شرح سرمایہ اردو، ص۱۸۸)

شارحین کی یہ لن ترانیاں اس بات کا نتیجہ ہیں کہ ایک نے جو جھک ماری ہے دوسرے نے اسے نقل کر کے اپنا دامن چھڑا لیا ہے۔ اس کے لیے دونوں نے اردو کی کسی معمولی سی لغت سے رجوع کرنے کی ضرورت بھی نہیں محسوس کی اور اٹکل سے معنی نکالنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ مصرعوں میں باہم ربط ہے یا نہیں۔ صرف خاص، مغلیہ دربار کی اصطلاح ہے اور اس روپے کے لیے استعمال ہوتی ہے جو فرمان روا اپنے خرچ کے لیے مخصوص کر لیتا ہے۔ خالصہ وہ زمینیں ہوتی ہیں جن کی آمدنی فرماں روا اپنے خرچ کے لیے مخصوص کرتا ہے۔ خالصہ جاری ہونا، خالصہ زمینوں کی آمدنی کا آجانا۔ تن کا لفظ تنخواہ کا مخفف ہے۔ دفترتن وہ محکمہ ہے جس سے تنخواہیں ملتی ہیں۔ سوال دستخطی، نوکری کی عرضی کو نہیں کہتے بلکہ بل کو کہتے ہیں۔

دوسرے بند کی شرح کو لیجیے، ہمارے بزرگ یوں گویا ہوتے ہیں:

"گاؤ زباں: ایک دوا، ایک بوٹی۔ کاتبی: خلعت۔ کاتبی خلد مکاں: خلعت مرحوم، فروخت شدہ

مطلب: ان کے گزارے کا حال بیان کرنے سے افسوس ہوتا ہے، اب ان کے مال خانے میں صرف پرانی ٹوٹی پھوٹی چیزیں ہی رہ گئی ہیں۔ اچھی اچھی خلعتیں سب پیٹ بھرنے کے لیے بک چکی ہیں۔ گاؤزبان شکل کی بوٹی تنور سے نکلنے کے بعد، گویا زبان حال سے کہتی ہے کہ میں اس وقت بکی ہوں جب صاحب گھر تین فاقہ کر چکے اور ان کی پوشاک فروخت ہو کر ان کے پاس کچھ روپیہ آیا اور وہ بہت ہی سستی بیچنی پڑی۔ کیونکہ ان کی قیمت کوئی زیادہ نہ لیتا تھا"۔ (رہنمائے اردو، ص۵)

دوسرے بزرگوار مسلسل ترجمہ نہیں دیتے صرف لفظوں کے وہی معانی درج کرتے

ہیں۔ جو شارح نمبر ایک نے دیے ہیں۔

کاتبی خلعت کو نہیں کہتے۔ دونوں نے محض قیاس چلایا ہے۔ اس طرح گاؤزبان ایک پودا ہے۔ لیکن اس کا یہاں کیا کام اور تنور سے کیا واسطہ۔ تنور سے جس چیز کا تعلق ہے، وہ روٹی کی اقسام میں سے ایک ہے۔ اس روٹی کی شکل گائے کی زبان جیسی ہوتی ہے۔ پاکستان کے بعض علاقوں میں آج کل بھی یہ روٹی استعمال میں آتی ہے۔ اب مفہوم ظاہر ہے۔

اس طرح ایف اے فارسی نصاب کی حالت بھی ناگفتہ بہ ہے۔ اس کے شارحین نے "کباب غاز" اور بعض دوسرے جدید فارسی کے اسباق کا جو حال کیا ہے، اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز ہے۔ جیسے جیسے اوپر کے درجوں میں آئیں، معاملہ اور بھی زیادہ خطرناک صورت اختیار کرتا جاتا ہے۔

یہ تو اس مسئلے کا ایک پہلو ہے۔ یہاں اس بات کا اقرار بھی ضروری ہے کہ یہ دھاندلی سب شرحوں میں نہیں ہے۔ خصوصاً پرانے بزرگوں کی وہ شرحیں جو نولکشور جیسے اداروں نے شائع کیں، ادب کے طالب علموں کے لیے آج بھی سرمایۂ بصیرت ہیں۔ مولانا عبدالمجید پیلی بھیتی اور ان کے رفقا نے جو کام کیا ہے، وہ آج بھی ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ جہاں لغت کی حدیں ختم ہوتی ہیں، وہاں سے ان شارحین کے کارناموں کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ کتابیں بذات خود مستقل تصانیف ہیں اور ہمارے فارسی و اردو ادب کے بہترین اور اہم ترین کارناموں میں شمار ہونی چاہییں۔ دور حاضر کے بزرگوں میں جنھوں نے درسی کتابوں کی شرحوں کا کام اعلیٰ پیمانے پر کیا ہے، ان میں اور نینٹل کالج کے شاداں بلگرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی شرحیں ایک ایسا معیار علم پیش کرتی ہیں، جس کی مثال ملنی محال ہے۔ جہاں تک موجودہ دور کے گمراہ کن سرمائے کا تعلق ہے، اس کا مقابلہ جب ان فضلا کی شرحوں سے کیا جاتا ہے تو خاصی جھنجلاہٹ ہوتی ہے۔

جہاں ایک طرف حکومت کے اس فیصلے پر مبارک باد دینے کو جی چاہتا ہے کہ آئندہ سے شرحیں اور نوٹ بند ہو جائیں گے، وہاں اچھے اور معیاری کارناموں کو دیکھ کر یہ صدمہ بھی ہوتا ہے کہ علم و فضلیت کے بعض نادر افکار سے بھی ہم لوگ محروم ہو جائیں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ گمراہ کن کتب کا سختی سے محاسبہ کیا جائے لیکن اچھے کارناموں کے زندہ

رہنے کی گنجائش بھی پیدا کی جائے۔ جو کتب خلط سلط مواد پیش کرتی ہیں، طلبہ کو سہل انگار بناتی ہیں، علمی تگ و دو کے راستے میں رکاوٹ ہیں، انھیں تو روکا جائے، لیکن جو شرحیں ان نقائص سے خالی ہیں، انھیں برقرار رہنے دیا جائے۔ چاہے وہ صرف طلبہ ہی کی ضرورت کو پورا کرتی ہوں اور اساتذہ کے لیے مفید نہ بھی ہوں، جب بھی انھیں برقرار اور بحال رہنے دیا جائے۔

دس سالہ تعلیمی پالیسی کا تنقیدی جائزہ

"قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۹۲ء تا ۲۰۰۲ء" حکومت کے ان وعدوں کے ایفا میں ترتیب دی گئی ہے، جن سے ہماری زندگی میں کئی بنیادی تبدیلیوں کی توقع ہے۔ پاکستان کی تاسیس سے اب تک وقتاً فوقتاً تعلیمی پالیسیاں وضع ہوتی رہی ہیں۔ ہر پالیسی کے خالقین کا یہ دعویٰ رہا ہے کہ "اس سے پاکستان کی تعلیمی حالت بالکل بدل جائے گی"۔ لیکن عملاً تعلیم کے پرانے نظام کو اسی طرح برقرار رکھا گیا اور وقت کے ساتھ ساتھ سیاسی حالات اور سماجی تبدیلیوں کے زیر اثر نظام تعلیم میں خرابیاں بڑھتی ہی چلی گئیں۔

تعلیمی رپورٹوں میں سب سے زیادہ اہم "قومی تعلیمی کمیشن کی رپورٹ" تھی، جو فلسفۂ تعلیم کی حیثیت سے غالباً بہترین دستاویز ہے۔ اس رپورٹ نے تعلیمی حلقوں میں رد عمل تو ضرور پیدا کیا، لیکن کوئی مثبت نتیجہ اسی لیے برآمد نہ ہو سکا کہ اسے بے دلی سے نافذ کیا گیا تھا اور اکثر اقدامات ادھورے چھوڑ دیے گئے تھے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو جملہ تعلیمی رپورٹوں کی ایک بنیادی خرابی یہ تھی کہ ان کے خالقین نے جن مالی وسائل کی توقع وابستہ کی تھی، ملکی حالات انھیں پورا کرنے کی پوزیشن

پاکستان کی وفاقی حکومت نے دس سالہ قومی تعلیمی پالیسی کا اعلان کیا، پالیسی کا جائزہ لینے کے لیے انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز- اسلام آباد نے قومی تعلیمی سیمینار (اپریل ۱۹۹۳ء) منعقد کیا اس موقع پر یہ خطبہ دیا، جو بعد ازاں اسی ادارے کی کتاب "قومی تعلیمی پالیسی- ایک جائزہ" میں بھی شائع ہوا۔

میں نہیں تھے۔ اسی لیے پالیسی کے صرف ایک حصے پر عمل کیا گیا، جس کا تعلق نئے نئے اداروں کی تخلیق اور تنخواہوں اور ترقیوں کے ساتھ تھا۔ باقی جتنے اہم پہلو ہو سکتے تھے، ان پر عمل در آمد یا تو ادھورے طور پر کیا گیا، یا سرے سے ہوا ہی نہیں۔ ہر برسر اقتدار آنے والی حکومت نے تعلیم کی اصلاح کو اپنے پروگرام میں نمایاں جگہ دی، لیکن اطلاق کے لحاظ سے یا تو بعض حصے ناقابل عمل تھے یا انھیں اساتذہ اور طلبہ کا وہ تعاون نہ مل سکا جس سے یہ پالیسیاں مفید اور موثر بنتیں۔

ہماری ہر حکومتی پالیسی میں ایک بنیادی خرابی یہ بھی رہی ہے کہ اسے نافذ کرنے والے افراد کے پیش نظر، اداروں میں کوئی انقلابی تبدیلی نہیں تھی۔ وفاقی حکومت کے کارکن جس نظام میں پرورش پاتے رہے ہیں، اس سے انحراف کو غیر ضروری جانا گیا۔ اس لیے ہر پالیسی میں مقاصد اور اطلاقی پہلوؤں کے درمیان کوئی قابل عمل رشتہ استوار نہیں کیا گیا۔ ہر مفید تجویز مستحکم سیاسی، سماجی حالات کا تقاضا کرتی ہے۔ یا تو سیاسی جماعتوں کے ڈر اور خوف کی وجہ سے یا ناقابل عمل ہونے کی بنا پر یا پھر اس لیے کہ اس کے اندر ایک آئیڈیلزم چھپا بیٹھا تھا جس کا تعلق پاکستان کی بجائے امریکہ یا برطانیہ سے تھا، اسے نافذ نہ کیا جا سکا۔ اس لیے سارے مفید پہلو محض زبانی جمع خرچ ہو کر رہ گئے۔ تعلیم کی پنیری اکثر گملوں میں لگائی گئی اور ملکی وسائل اور ملکی حالات سے اس کا کوئی قابل فہم رشتہ قائم کرنے کی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی۔ موجودہ تعلیمی پالیسی پر تبصرہ کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے طریق تشکیل پر بھی تھوڑا سا غور کر لیا جائے۔

ہر تعلیمی پالیسی میں حکومت کی طرف سے ملنے والے mandate کی روشنی میں پالیسی کے مختلف پہلوؤں کا الگ الگ جائزہ لیا جاتا رہا ہے اور سب کمیٹیوں کی رپورٹوں کی روشنی میں وفاقی تعلیمی پالیسی کو تشکیل دینے کا مرحلہ آخر میں آیا کرتا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ تعلیمی پالیسی میں اس طریقہ کار سے انحراف کیا گیا ہے۔ اس کا خاکہ اور ضروری تفصیلات، محکمے کے اعلیٰ انتظامی افسروں نے خود تیار کی ہیں۔ ادارے کے ماہرین تعلیم میں سے اکثر کا تعلق پچھلے ۱۰ برس میں کسی تعلیمی درس گاہ سے نہیں رہا اور اسی لیے تعلیمی دنیا کی عملی مشکلات کو مد نظر نہیں رکھا گیا۔ جو خاکہ تیار کیا گیا، وہ ملکی عزائم سے تو ممکن ہے تعلق رکھتا ہو، لیکن عملی لحاظ سے ہماری عام معاشرتی زندگی اور درس گاہوں کی موجودہ تعلیمی حالت

سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔

پالیسی کی تشکیل کے دوسرے مرحلے میں بعض مختلف الخیال احباب کو جمع کر کے غور کرنے کی دعوت دی گئی۔ ان سرکاری اور غیر سرکاری دانشوروں میں تعلیم کے محکمے سے تعلق رکھنے والے لوگ تو تھے، لیکن خود درس گاہوں کے لوگوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ ذاتی پسند اور ناپسند کے اصول پر رپورٹ کے بعض اجزا بحال اور بعض خارج کیے جاتے رہے۔ اخراج اور اضافوں کا یہ عمل ایک مرتبہ نہیں بلکہ بار بار ہوا۔ مختلف مفادات کی لیک نے کاٹ چھانٹ میں اپنے اپنے حقوق اور مراعات کے تحفظ کی صورتیں پیدا کیں، تا آنکہ کابینہ میں رپورٹ پر غور ہوا۔ کچھ شقیں یہاں بھی حذف کی گئیں اور بچا کھچا حصہ "تعلیمی پالیسی ۱۹۹۲ء-۲۰۰۲ء" کہلایا۔

وفاقی کابینہ میں ماہرین تعلیم کی تعداد کمیٹیوں کے مقابلے میں بھی کم تھی۔ سب سے زیادہ نازک مسئلہ نفاذ اسلام اور ذریعہ تعلیم کا تھا، جنہیں حساس پہلو جانتے ہوئے یا تو چھیڑا ہی نہیں گیا، یا ڈھکے چھپے انداز میں اس کا اظہار ہوا۔ ترمیم و تنسیخ کے اس عمل کے بعد تعلیمی پالیسی کو عوام کے سامنے لایا گیا ہے۔ طریقہ کار کا یہ ہولناک اور غیر سائنٹفک طریق کار ہی رپورٹ کے داخلی تضادات کا سبب ہوا ہے۔ اگر رپورٹ سازی کا فطری اور مروجہ جمہوری طریقہ اختیار کیا جاتا تو شاید اس کے اندر بعض تضادات کم ہو جاتے اور اصولوں اور ان کے اطلاق کے درمیان اتنے فاصلے نہ ہوتے جتنے موجودہ صورت میں پیدا ہوئے ہیں۔

ہمارے نظام تعلیم میں جو زوال کارفرما ہے، اس کی طرف ہلکے ہلکے اشارے رپورٹ میں موجود ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ رپورٹ کے خالقین کے پیش نظر موجودہ تعلیمی حالات کی خرابیوں کے اسباب ضرور موجود رہے ہوں گے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کہاں تک نیا تعلیمی ڈھانچہ ہماری توقعات کو پورا کرتا ہے؟

تعلیم صوبائی موضوع (subject) ہے۔ برطانوی استعماری دور ہی سے ہمارے ہاں یہ دو عملی کارفرما رہی ہے کہ تعلیم صوبے کا عنوان رہی۔ اس کے باوجود مرکز میں ہمیشہ تعلیم کی ایک الگ وزارت قائم رہی ہے۔ دونوں کے درمیان رابطے کا ایک اصول یہ رہا ہے کہ وفاق صرف پالیسی کے بارے میں فیصلے کرتا ہے، جبکہ ان پر عمل درآمد اور دیگر تفصیلی امور صوبوں کی صوابدید پر رہے ہیں۔ جمہوری نظام میں اس کے امکانات ہمیشہ ہوتے ہیں کہ مرکز

اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ طاقتور بناتا چلا جائے اور وہ معاملات بھی عملاً اپنی تحویل میں لیتا چلا جائے جو مرکز کے فرائض میں شامل نہیں۔

۱۹۷۳ء کے آئین میں موضوعات کی دو فہرستیں ہیں ایک حصہ "الف" اور دوسرا "ب" جو بالآخر کلی طور پر صوبوں کے حوالے ہوگا۔ اس لحاظ سے مرکزی حکومت کا تعلق صرف ان امور سے رہ جاتا ہے، جو صوبوں کے درمیان تعلیمی فہرست "ب" کی یکسانی کے لیے ضروری ہوں۔ وفاقی حکومت کے اہل کاروں کو یہ احساس ہے کہ تعلیم کا مسئلہ بنیادی طور پر صوبوں ہی کا مسئلہ ہے اور اس میں پیش رفت صوبے ہی کر سکتے ہیں لیکن جیسا کہ وفاقی طرز حکومت کا خاصہ ہے کہ اپنے اختیارات بڑھانے کا عمل ہماری زندگی کا بنیادی وصف بن چکا ہے۔ بعض نئے امور پر مزید اختیارات کے حصول کے لیے مالی معاملات کا سہارا ناگزیر تھا، کیونکہ یہی اختیارات کی توسیع کا بالواسطہ انداز ہو سکتا ہے۔

کئی برس پیشتر یہ مسلمہ طریق کار تھا کہ یونیورسٹیوں کو گرانٹ صوبائی حکومتیں دیتی تھیں، مالی اختیار کی وجہ سے یونیورسٹیوں پر صوبائی حکومت کا اختیار رہتا تھا۔ جب مرکز نے "یونیورسٹی گرانٹس کمیشن" (UGC) کے ذریعے اپنے حلقۂ اختیار میں توسیع کر لی تو عملاً یونیورسٹیاں مرکزی حکومتوں کی دست نگر ہو گئیں اور مالی و انتظامی امور میں اس دو عملی نے حالات کو بے قابو کیا۔ اب تعلیم دو شوہروں کی بیوی نہیں بلکہ تین شوہروں کی بیوی ہے۔ وائس چانسلر بیک وقت مرکز کا اطاعت گذار بھی ہے اور صوبوں کا بھی۔ تیسری طاقت سیاست کے حوالے سے طالب علم بن گئے۔ وائس چانسلر اس صورت حال میں تین اطراف سے دباؤ کا شکار ہوئے۔ پھر وائس چانسلروں کا انتخاب معیار اور صلاحیت کی بجائے سیاسی دباؤ اور اثر و رسوخ پر منحصر ہو گیا۔ اب یہ کرسیاں اقتدار کی سیڑھیاں بن گئیں۔ اپنی وائس چانسلری کو کامیاب دکھانے کے لیے ضروری ٹھیرا کہ اخباروں سے رابطہ رکھا جائے اور وائس چانسلر کی تصویریں اخباروں میں نظر آئیں۔ اور طالب علموں کو خوش کرنے اور مالی وسائل مہیا کرنے کا بھی یہی سبب بنا

شیخ بھی خوش رہے، شیطان بھی ناراض نہ ہو

وقت کے ساتھ ساتھ وائس چانسلر شاہ دولے شاہ کے چوہے بن کر رہ گئے اور اس کے نتیجے میں تعلیمی کارکردگی بے انتہا متاثر ہوئی۔

صوبائی حکومت اور مرکزی حکومت کے درمیاں اختیارات کی قابل عمل تقسیم ابھی تک نہیں ہو پائی۔ رپورٹ میں بھی اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ شاید اسے زیادہ اہم مسئلہ ہی نہیں سمجھا گیا۔ اس کے مقابلے میں مرکزی حکومت کے وسائل اور اختیارات کو زیادہ کارگر اور طاقت کا اصل سرچشمہ بنانے کے لیے رپورٹ میں کچھ گنجائشیں رکھ دی گئی ہیں۔ مرکز میں بعض نئے اداروں کی تشکیل کی تجاویز اسی ذیل میں آتی ہیں۔ یونیورسٹیوں کو مالی لحاظ سے زیادہ سے زیادہ حکومت کا دست نگر بنا کر جمہوری راستے مسدود کیے گئے ہیں۔

یونیورسٹیوں میں امن قائم رکھنے کے لیے طلبہ کی تعداد کم کرنے کا رحمان بڑھا۔ اعلیٰ تعلیم کو محدود کرنے کے لیے اس تعلیمی رپورٹ میں دو قسم کی تجویزیں پائی جاتی ہیں۔ ایک تو طالب علموں کی ٹسٹنگ سروس کا اجراء (ص ۳۰، شق ۵، ۳، ۷) دوسرے وفاقی گرانٹ کی تقسیم کو ایک نئے ادارے Netcome کے سپرد کرنے کی تجویز، (ص ۲۲ شق ۱۶، ۳، ۵)۔ یہاں بھی مرکز کی طاقت بڑھا دی گئی ہے بلکہ جہاں جہاں بھی نئے وفاقی اداروں کی تاسیس و قیام کا تذکرہ ہے، وہاں صوبوں کے لیے بعض متوازی ادارے قائم کرنے کی سفارش بھی کی گئی ہے۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دوہرے نظام کو رفتہ رفتہ کم کرنے کی بجائے دو متوازی سلسلے مستقل طور پر برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تعلیم کا دوسرا بنیادی مسئلہ، تربیت کا ہے۔ برطانوی نظام تعلیم میں تدریس، حکومت کے اختیار میں چلی گئی اور تربیت، والدین کے فرائض میں شامل ہوئی۔ عالم اسلام میں پرانے زمانے میں کبھی بھی تعلیم حکومت کی ذمہ داری نہ تھی، بلکہ نجی شعبہ اسے انجام دیا کرتا تھا، حکومت صرف مالی امداد و اعانت دیتی تھی۔ برطانوی نظام کو اختیار کرنے کے بعد تعلیم کی پوری ذمہ داری حکومت کے حصے میں آئی اور تربیت، والدین کی ذمہ داری ہو گئی۔ یہیں سے ہمارے ہاں سیکولر تعلیم کا تصور رائج ہوا۔ اقتصادی ترقی سے پاکستان کی صورت حال بدل گئی ہے۔ اب تربیت نہ حکومت کی ذمہ داری رہی ہے اور نہ والدین کی۔ تعلیمی اداروں میں سیاست در آئی ہے۔ استاد کا رابطہ طالب علم سے کمزور ہو چکا ہے اور طالب علموں پر سیاسی اداروں کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہو چکی ہے۔ تعلیمی معیار اور اس کی اہمیت مشکوک ہوتی چلی گئی۔

جتنی تعلیمی رپورٹیں پاکستان میں شائع ہوئی ہیں، ان میں ہر رپورٹ نے استاد کو قصور

وار قرار دیا ہے۔ ہر خرابی کا ذمہ دار استاد قرار پاتا رہا۔ موجودہ تعلیمی رپورٹ میں نفاذ اسلام کے تحت جگہ جگہ اس کا بالواسطہ اظہار ملتا ہے۔ صرف اساتذہ کی اخلاقی تربیت اور کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے اسلامی اقدار کو رائج کرنے کی خواہشات اسی جہت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ (ص ۱۴ شق ۱، ۳، ۳)۔ زیر ملازمت تربیت کا خصوصی پروگرام (شق ۱، ۵، ۳) اخلاقی تربیت کا انصرام (۲، ۵، ۳)، مسلم فلاسفروں کے کارناموں کو نصاب کا لازمی حصہ بنانے کی تجویز (۳، ۳، ۳)، اسکولوں میں صبح کی دعا میں اخلاقی سبق اور کردار سازی کی تلقین (۴، ۳، ۳) اور ٹیلی ویژن کے ذریعے اسلامی اقدار اور اسلام کے دنیاوی تناظر کا تذکرہ (۵، ۳، ۳) رپورٹ میں درج ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ باتیں تعلیمی صورت حال کو درست کرنے اور کردار سازی کے لیے کافی ہیں؟

میری رائے میں یہاں رپورٹ ایک داخلی تضاد کی شکار ہے۔ رپورٹ کے خالقین کو یہ احساس تو ہے کہ موجودہ حکومت (یعنی نواز شریف حکومت ۹۳-۱۹۹۲ء) اسلام کے بارے میں ہمدردانہ نقطۂ نظر رکھتی ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ رپورٹ کے خالقین، اسلام کی اصطلاحات سے خوف زدہ بھی ہیں اور انھیں "بنیاد پرست" (Fundamentalist) کہے جانے کا خوف بھی دامن گیر ہے۔ وہ اسلام کے صرف انھی پہلوؤں کے نفاذ میں دلچسپی رکھتے ہیں جو آسانی سے جدید اصطلاحوں میں بیان ہو سکیں، یعنی اصل تضاد فکری ہے۔ ہمارا عمل سیکولر ریاست کے تصور کا گرویدہ ہے اور اسلام کا نام محض تزئین و آرائش کے کام آتا ہے۔ مذہبی دباؤ کا نتیجہ یہ ہے کہ دونوں کے درمیان فاصلے قائم کر دیے جائیں۔ اسلام کو الگ مضمون کے طور پر پڑھا کر پہلے ہی اس کی روک تھام کا مؤثر انتظام ہو چکا ہے، اب اسلامی فکریات کو بھی الگ لازمی مضمون بنا کر سیکولرزم کا راستہ کھلا رکھا جا سکتا ہے۔ سائنس کو اولین ترجیح قرار دیتے ہوئے جا بجا رپوٹ میں ایسے اشارے درج ہیں کہ "سائنس اور مذہب میں کوئی دوئی نہیں۔" یہ استدلال اپنی جگہ پر درست ہیں، تاہم سائنس کی تعلیم کو اسلام کے قریب تر لانے میں ایران کی مثال بھی ہمارے لیے سودمند ہو سکتی تھی۔ لیکن "بنیاد پرست" کہلانے کے خوف نے ہمیں اس کی طرف جانے ہی نہیں دیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہم نے جس طرح اسلامیات کے مضمون کو الگ نام دے کر پاکستان میں جملہ مضامینِ تدریس کو اس میں سرایت کرنے سے روک دیا ہے، اسی طرح اسلامی تعلیم کے فکری رخ کو بھی ایک

نیا مضمون بنا کر نفاذ اسلام کا راستہ روکنے کی کوشش کی گئی ہے (ص ۱۳ تمہیدی نوٹ)۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کا ورلڈ ویو (ص ۱۴) اسلام اور قرآنی تعلیمات کا ورلڈ ویو (ص ۱۴)۔ ملت کے احساس کمتری کو دور کرنے کے لیے اساتذہ کی تربیت (ص ۱۵) اور اسلام کے اخلاقی فلسفۂ تعلیم کا جو سہارا لیا گیا ہے (ص ۱۲)، وہ ہمارے پالیسی سازوں کی ذہنی پسپائی اور عملی بے چارگی کا ثبوت ہے۔ مسلمان فلاسفہ کے کارناموں کو لازمی مضمون بنانے کے لیے جو سفارشیں، اور صبح کی دعا میں سکولوں اور کالجوں میں اخلاقی تعلیم کا جو درس شامل ہے، وہ دینی، سیکولر اور دینی تعلیم کے الگ الگ دائروں کو ظاہر کرتا ہے۔ تعلیمی ریسرچ کے اداروں کی تحقیق پر زور بھی اسی رویے کا واضح ثبوت ہے۔ تربیت کی اہمیت کو صرف استاد کے کھاتے میں ڈالنے اور نصاب میں سمونے کی بجائے، اسلامی فکر کو جداگانہ مستقل مضمون بنانے کی مساعی اسی تضاد کے اشارے ہیں کہ مبادا ایسا نہ ہو کہ اسلام ہمارے تعلیمی نصابات میں روح کے طور پر جاری و ساری ہو جائے۔

تربیت کے مسئلے کو تعلیمی پالیسی میں دانستہ طور پر حل نہیں کیا گیا۔ اس کا حل صرف تادیبی طرز فکر سے کیا گیا ہے۔ وہ سیاسی اور سماجی عوامل جن سے تعلیم میں بنیادی خرابیاں پیدا ہوئیں، زیادہ توجہ کی متقاضی تھیں، لیکن ان کا علاج صرف تادیبی حربوں میں ڈھونڈا گیا ہے۔ یہ تادیبی حربے قوت نافذہ کی غیر موجودگی کی وجہ سے بے کار ثابت ہوئے ہیں۔ طلبہ کی سیاسی دلچسپیوں کو تو قابل مواخذہ گردانا گیا ہے، لیکن اساتذہ کی تنظیموں اور دفتری افراد کی انجمنوں کے بارے میں رپورٹ خاموش ہے۔ ص ۲۶، ۲۷ پر استادوں کے ریفریشر کورسز اسی معمولی جھاڑ پونچھ کی مثال ہیں۔ سائنس میں اسلام کی کارکردگی سے قطع تعلق کر کے سماجی علوم کے بارے میں رپورٹ نے اسلام کو الگ کالونی بنانے کا طریق اپنایا ہے (ص ۴۱) اور اسلامی سماجی علوم کو بطور ایک جداگانہ مضمون رکھنے کی خواہش کا اظہار کیا گیا ہے (ص ۴۱ شق ۳، ۳، ۱۰)۔

ہر صوبے میں ایک الگ ادارہ (شق ۴، ۳، ۱۰) اور مرکز میں بھی ایک ادارہ برائے شماریاتی علوم (شق ۵، ۳، ۱۰) ہماری دو عملی کے زندہ مظاہر ہیں۔ وفاقی کنٹرول کے لیے ایک "وفاقی کونسل برائے سماجی علوم" اور نصاب سازی کے لیے مرکز میں صوبوں سے بالا ایک نظام وضع کرنے کا طریق کار یہی تو ہے (ص ۴۴)۔ کلاسوں میں تعداد کم کرنے کا اشارہ

بھی اعلیٰ تعلیم کو محدود کرنے (ص ۴۴ - شق ۹، ۳، ۱۱) کی طرف ایک ابتدائی قدم قرار دیا جا سکتا ہے۔ گویا رپورٹ کے خالقین نے معاشرتی برائیوں کا سد باب صرف اس سے کیا ہے کہ ایک ضابطۂ اخلاق بنایا جائے (ص ۴۴۔ ۴۔ ۳۔ ۱۱) ضابطہ اخلاق کا یہ مغربی تصور ہمارے معاشرے میں جڑیں پکڑ نہیں سکا۔ محض ضابطہ اخلاق وضع کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا، جبکہ ان کے پیچھے شعوری عمل کارفرما نہ ہو۔

رپورٹ میں وائس چانسلروں کے اختیارات بڑھانے کا ذکر کیا گیا ہے (ص ۴۴، شق ۱۵۔ ۳۔ ۱۷) اور طالب علموں سے عدالتی چارہ جوئی کا حق واپس لے لیا گیا ہے۔ اس طرح کیمپس میں سیکورٹی فورس کا قیام (۵۔ ۳۔ ۱۱) اور امتحانات میں نقل کے رجحان کی روک تھام کے لیے سخت اقدامات (۱۱۔ ۳۔ ۱۱) استادوں کو مجسٹریٹ کے اختیارات دینے کی تجویز (۸۔ ۳۔ ۱۱) حاضریوں کو ۸۰ فی صد کرنے کا مشورہ (۱۸۔ ۳۔ ۱۱) اور امور طلبہ کے انچارج کو "محتسب" کا درجہ دینے کا فیصلہ (ص ۴۳، ۱۔ ۳۔ ۱۱) میرے نزدیک منفی اقدامات ہیں، جن پر معاشرے کی دگرگوں حالت کے پیش نظر عمل ناممکن ہے۔ یہ سارے اقدامات عام حالات میں معاشرے کو باوقار بنا سکتے ہیں، لیکن ہماری حالت ایسی ہے کہ یہاں فی الحال یہ نتیجہ خیز نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ان کے پیچھے عمل درآمد کی قوت سرے سے موجود ہی نہیں۔ ایسے معاشرے کو محض منفی تجاویز سے قابو میں رکھنا ممکن نہیں۔ ہر وقت پولیس ایکشن کی سی حالت تعلیمی اداروں کی نارمل زندگی کو کمزور سے کمزور تر کرنے کا سبب ہو گی۔ تاآنکہ پورا معاشرہ صحت مند اور منظم نہ ہو جائے، ان تجاویز پر عمل کیا ہی نہیں جا سکتا۔ مقام شکر ہے کہ حکومت ان مسائل کو محسوس تو کرنے لگی ہے، لیکن ابھی تک ان کے قابل عمل حل کی طرف تعلیمی رپورٹ ہماری رہنمائی نہیں کرتی۔ ٹیلی ویژن چینل سے اخلاقی وعظ و تلقین فائدہ مند نہ ہو گی۔ ٹی وی چینل کو ایک حد تک ان ضرورتوں کے لیے استعمال کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے، گویا حکومت اپنے سابقہ فیصلے پر بھی قائم نہیں ہے۔ شروع میں اس چینل کو صرف تعلیم کے لیے مخصوص کرنے کا خیال تھا، لیکن اس میں بھی ترمیم ہو چکی ہے (ص ۱۵)۔

اس رپورٹ میں اس امر کے پیش نظر کہ ملک کی آبادی کا ۷۴ فیصد حصہ دیہات میں آباد ہے اور تعلیم کو شہروں کی بجائے دیہاتوں تک پھیلانا حکومت کی ذمہ داری ہے، بعض بڑے نیک عزائم کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس کے لیے فنڈ مہیا کرنے کی تجویز بھی معقول ہے۔

لیکن عملاً اس کی صورت یہ ہے کہ مروجہ نظام میں جو خرابیاں تھیں، انھیں ہم شہروں سے دیہات تک پھیلانے کے مرتکب ہوں گے۔ ہم نے تعلیم کے عمومی سانچے کو بدلنے کا اہتمام نہیں کیا، بلکہ پورے نظام کو اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ وسیع کرنے پر سارا زور صرف کر دیا ہے۔

ہماری ترجیحات بھی غور طلب ہیں۔ رپورٹ میں سارا زور کمپیوٹر کو رائج کرنے پر صرف ہوا ہے (ص ۲۶)۔ اور یہ بات بھی بین السطور میں دیکھی جا سکتی ہے کہ "حکومت دوسرے ممالک سے خیرات میں کمپیوٹر حاصل کرے گی اور انھیں گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ اداروں میں پہنچایا جائے گا۔" ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ سائنس کو مقبول بنانے کے لیے عوام کو science minded بنانا ضروری ہوگا ورنہ ہمارے اقدامات نتیجہ خیز نہ ہوں گے۔ یہ بھی مسلم ہے کہ ہماری ترجیحات میں سائنس کو اولیت کا درجہ ملنا چاہیے۔ ہم ترقی یافتہ معاشرے نہیں ہیں، ہم پس ماندہ ہیں اور ہمارے محدود مالی وسائل قوم کو سائنس یافتہ بنانے کی راہ میں حائل ہیں۔ ہمیں تو سائنس اور ٹیکنالوجی کے لیے افرادی قوت کا تعین کرنا ہوگا اور تعداد مقرر کرنی پڑے گی۔ ایسے افراد کو تیار کرنے کے لیے ملکی ذرائع کا کتنا حصہ حکومت بآسانی ادا کر سکتی ہے؟ حکومت تو یہ بھی نہیں جانتی کہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کا کتنا حصہ سائنسی تربیت کے لیے کارآمد ہوگا۔ محدود مالی وسائل کے ساتھ ساری قوم کو سائنس میں جھونک دینا مفید نہیں ہوگا۔

کردار سازی میں سماجی علوم کی جو کارکردگی ماضی میں اہم رہی ہے، اس سے اب بھی فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔ ہمیں سماجی علوم کی اہمیت کو بھی تسلیم کرنا ہوگا۔ بلاواسطہ کی بجائے بالواسطہ کردار سازی، نظام تعلیم کو زیادہ مستحکم کر سکتی ہے۔ جب تک ہم اسے تسلیم نہیں کرتے، سٹوڈنٹس ٹیچر سنٹر کا قیام، سپیشل انعامات دینے کا طریقہ، یوتھ ہاسٹلز کا قیام، لازمی ٹیوٹوریل نظام کا رواج، قابلیت کے وظائف اور میرٹ کے وظائف، گائیڈینس کے مغربی تصورات، ہماری معاشرتی زندگی کے لیے اجنبی ہی رہیں گے۔

تعلیمی مسائل میں سب سے اہم مسئلہ ذریعہ تعلیم کا ہے۔ اس وقت بنیادی طور پر دو میڈیم چل رہے ہیں (بلکہ بعض صوبوں میں ان کی تعداد اس سے بھی زیادہ ہے)۔ اس کثرت کو وحدت میں بدلنے کے لیے اس تعلیمی رپورٹ میں ہمیں کچھ نہیں ملتا۔ قومی زبان کا

ذکر صفحہ ۱۸ پر آیا ہے۔ اور فیصلہ یہ کیا گیا ہے کہ "ذریعہ تعلیم قومی زبان یا انگریزی ہو گی"۔ گویا وہ دوئی جو تعلیمی نظام کو خراب کر رہی تھی، اسے آئندہ کے لیے بھی برقرار رکھا گیا ہے۔ صفحہ ۲۱ پر رسم الخط کا مسئلہ اٹھایا گیا ہے، یہاں پر "قومی زبان" (national language) کا لفظ موجود نہیں، بلکہ اس کی جگہ پاکستانی زبانوں (Pakistani languages) کی اصطلاح درج ہے جو آئین پاکستان کی متعلقہ دفعات کے خلاف ہے۔ اس سے پالیسی سازوں کے اصل نقطۂ نظر کا پتہ چلتا ہے۔ یہ کہا گیا ہے کہ قرآنی رسم الخط سب زبانوں میں مشترک ہے، اس لیے یہ تجویز کیا گیا ہے کہ حروف تہجی میں کچھ نئے حرف شامل کیے جائیں۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ رپورٹ کے خالقین بنیادی لسانی اصولوں سے بھی ناواقف ہیں۔ حروف تہجی میں اضافے کی یہ تجویز ایک نئے جھگڑے کا سبب تو بن سکتی ہے، مگر اس سے کسی مرض کا علاج ممکن نہیں ہے۔ تیسری بار صفحہ ۲۵ پر ذریعہ تعلیم کا ذکر ہوا ہے اور یہاں "قومی زبان" کا لفظ حذف کر دیا گیا ہے۔ آئین پاکستان (۱۹۷۳ء) کی بنیادی دفعات سے یہ انحراف غور طلب ہے۔ پہلے یہ کہا گیا ہے کہ "ذریعہ تعلیم کے طور پر انگریزی کو قائم رکھا جائے گا اور یہ عمل اردو اور دوسری زبانوں کے متوازی چلے گا"۔ ساتھ ہی ساتھ اگلی شق میں "ابتدائی تعلیم میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے لیے انگریزی کو ذریعہ تعلیم کے طور پر اختیار کرنے کی اجازت بھی دی گئی ہے"۔ اس صورت حال میں قومی زبان کے حامیوں کو غور کرنا پڑے گا کہ رپورٹ میں کس طرح درجہ بہ درجہ قومی زبان کی حیثیت کم سے کم تر کی گئی ہے، اور پھر اسے آخر میں "صوبوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے"۔ جو کام مرکزی حکومت کے کرنے کا تھا، اس کی ذمہ داری صوبوں پر ڈالی گئی ہے۔

رپورٹ کے صفحہ ۵۷ کی بعض شقیں بھی غور طلب ہیں۔ ان میں نجی شعبے میں انگریزی ذریعہ تعلیم کے اداروں کو بالواسطہ تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔ گویا وہ ساری خرابیاں جو ہمارے نظام تعلیم میں پہلے سے چلی آ رہی تھیں، انھیں علیٰ حالہ رہنے دیا گیا ہے۔ رپورٹ کے خالقین کو یہ احساس ہے کہ تعلیم اب محض تعلیم نہیں رہی، تجارت بھی بن چکی ہے۔ پہلے غیر سرکاری تعلیمی ادارے مشن کے تحت چلائے جاتے تھے، اب یہ انڈسٹری بن چکے ہیں۔ اسی صفحے پر پرائیویٹ سیکٹر میں مالی تحفظ کے اقدامات کا تذکرہ بھی ہے۔ اسی صفحہ ۲۵ پر بورڈوں کو کلی طور پر نصابی کتابیں فروخت کرنے کے ادارے رکھنے کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ سیکٹر میں

درسی کتابوں کی مسابقت کا ذکر بھی ہے۔ ہر کورس کے لیے نصابی کتب میں پرائیوٹ پبلشروں کی شرکت کے تذکرے عملی طور پر کیا شکل اختیار کریں گے؟ معلوم نہیں! لیکن حکومتی اداروں کو میری رائے میں تجارتی بنیادوں پر فروخت اور طباعت کتب کا کام دیتے رکھنا غیر ضروری ہوگا۔ ٹیکسٹ بک بورڈوں سے یہ اختیار لے کر صحت مندانہ مسابقت کے اصول کو سرکاری شعبے میں بھی پروان چڑھانے کی ضرورت ہے۔ صرف نجی شعبے کو یہ رعایت دینا عملاً دو عملی کا باعث ہوگا۔

مجموعی طور پر میری رائے میں یہ رپورٹ اپنی تمام تر خوبصورت انگریزی، سائنس کے بارے میں نرم گوشوں، نفاذ اسلام کی نیک خواہشات کے باوجود عملی طور پر اپنے مقاصد میں کامیاب نظر نہیں آتی۔

اس مقالے میں جن نکات پر بات چیت کی گئی ہے ان کا خلاصہ یہ ہے کہ

۱۔ وفاق نے اپنے اختیارات میں توسیع کی ہے۔ نئے نئے ادارے قائم کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔

۲۔ نفاذ اسلام کو ایک الگ مستقل مضمون میں محصور کر کے تعلیم کے عام مزاج کو بدستور سیکولر رکھا گیا ہے۔

۳۔ کردار سازی کے لیے جو اقدامات تجویز کیے گئے ہیں وہ ناکافی ہیں، ان سے تعلیم اور تربیت کی دوئی برقرار رہتی ہے۔

۴۔ کردار سازی کے لیے مجوزہ تادیبی حربے غیر مؤثر ہیں، کیونکہ ان کے پیچھے قوتِ نافذہ موجود نہیں۔

۵۔ اعلیٰ تعلیم کو محدود کرنے کا رحجان ابھی قبل از وقت ہے، کیونکہ ابھی تو عام خواندگی کو بھی ہم وسیع نہیں کر پائے۔

۶۔ ذریعہ تعلیم کے مسئلے کو پس پشت ڈالا گیا ہے اور طبقاتی نظام تعلیم کو مضبوط کیا گیا ہے۔ جس سے تعلیم بدستور دو دھاروں میں منقسم رہے گی۔

۷۔ سماجی علوم کو مناسب اہمیت نہیں دی گئی اور سائنس کے لیے افرادی قوت کے تعین کا کوئی طریق کار بھی وضع نہیں کیا گیا۔

پاکستان کے تعلیمی مسائل-ایک مکالمہ

س: ڈاکٹر صاحب، ایک رائے یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ذہین لوگ اول تو تدریسی پیشہ میں آنا پسند نہیں کرتے اور اگر آجائیں تو پھر بہت جلد اس پیشے کو ترک کر کے دوسرے پرکشش پیشوں میں چلے جاتے ہیں۔ اس بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟ نیز تعلیم کے پیشے کو پرکشش بنانے کے لیے آپ کیا اقدامات تجویز فرمائیں گے؟

ج: سوال میں بیان کردہ صورت حال بڑی حد تک صحیح ہے۔ لیکن اس کو سمجھنے کے لیے ہمیں تاریخی پس منظر میں جانا ہوگا۔

پاکستان کے قیام سے پہلے تعلیمی اداروں میں اکثریت ہندو اور سکھ اساتذہ کی تھی۔ قیام پاکستان کے وقت ان اساتذہ کے بھارت چلے جانے کے بعد جو خلا پیدا ہوا اسے فوری طور پر پر کرنے کی ضرورت تھی۔ یہ خلا ایسے اساتذہ سے پُر کیا گیا جن کی تعلیمی استعداد مقررہ معیار کے مطابق نہ تھی۔ اس طرح تیسرے درجے کے اساتذہ اکثر کالجوں اور اسکولوں میں جگہ پا گئے۔ صوبہ پنجاب کے حوالے سے بات کریں تو تقسیم کے وقت یہاں شعبہ تعلیم میں اور گورنمنٹ کالج لاہور، میں داخلے کی مقررہ نسبت کچھ یوں تھی:

۱۔ مسلمان	چالیس فی صد
۲۔ ہندو	چالیس فی صد

ماہ نامہ محفل لاہور (جولائی ۱۹۹۵ء) کے لیے یہ مکالمہ ڈاکٹر انجم رحمانی نے مرتب کیا۔

۳۔ دوسرے مذاہب بیس فی صد

گویا کہ ہندوؤں اور سکھوں کے بھارت چلے جانے کے بعد جو خلا پیدا ہوا وہ پچاس ساٹھ فی صد تیسرے درجے کے اساتذہ سے پُر ہوا۔

یونیورسٹی میں حالت کسی قدر مختلف تھی۔

پنجاب یونیورسٹی میں ہندو اور سکھ پوری طرح چھائے ہوئے تھے۔ یہی حال لاہور کے گورنمنٹ کالج، ایف سی کالج اور دیال سنگھ کالج وغیرہ کا تھا۔ صرف اسلامیہ کالج میں مسلمان طلبہ اور اساتذہ کی تعداد اسی فی صد تھی۔ اکثر کالجوں میں بشمول ایس ڈی کالج اور ڈی اے وی کالج، غیر مسلم چھائے ہوئے تھے، ہندوؤں سکھوں کے چلے جانے کے بعد نتیجے کے طور پر جو خلا پیدا ہوا، وہ اسی نوے فی صد کے قریب تھا۔ اس لیے اعلیٰ تعلیم میں معیار گرنے کا عمل بھی اسی تیزی کے ساتھ ہوا۔

قیام پاکستان کے بعد مہاجرین کی آباد کاری کے علاوہ کئی دوسرے سنگین مسائل درپیش تھے۔ سماجی کام کرنے والے طلبہ کو قومی خدمت کی ڈگریاں دی گئیں۔ ان میں سے اکثر لوگ تعلیم کے شعبے میں آئے۔ اس زمانے میں پاکستان میں اقتصادیات کے مضمون کا بول بالا تھا یا پھر لوگوں میں انجینئری اور وکالت کی طرف جانے کا رحجان تھا۔

معیار کے اعتبار سے سب سے زیادہ باعزت نوکری، مقابلے کے امتحان تھے۔ اسی صورت حال کا نتیجہ تھا کہ زیادہ تر طلبہ وکالت، انجینئری، اقتصادیات اور مقابلے کے امتحانات کی طرف جاتے تھے۔ نئے نئے بنک بھی کھلے تھے۔ اس لیے اقتصادیات میں اچھے نمبر حاصل کرنے والوں کے لیے میدان زیادہ وسیع تھا۔

انجینئری میں ہندوؤں کے جانے کے بعد ایک بڑا خلا پیدا ہوا، جسے پُر کرنے کے لیے ذہین طلبا کی کثیر تعداد اس پیشے سے وابستہ ہو گئی۔ تعلیم کے پیشے کی طرف بچا کھچا مال آیا۔ ان میں سے اکثر اساتذہ ایک آدھ برس نوکری کرنے کے بعد اہم عہدوں کی خاطر مقابلے کا امتحان پاس کر کے تعلیم کا پیشہ چھوڑ جاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان بننے کے بعد معیار تعلیم گرنے لگا۔

تعلیم کے محکمے میں اکثر وہی لوگ آتے تھے جن کی عمر زیادہ ہو جاتی تھی اور انھیں کسی دوسرے شعبے میں سرکاری نوکری نہیں مل سکتی تھی۔ اندریں حالات اس پیشے سے متعلق

افراد شدید نفسیاتی دباؤ کا شکار رہے۔ اس طرح وہ اپنے پیشے کو باوقار بنانے کے لیے ٹریڈ یونین طریق کار کا سہارا لینے لگے۔ بعد میں ایڈہاک نوکریوں کے ذریعے پچھلے راستے سے آنے والے بڑھتے چلے گئے۔

قیام پاکستان کے بعد اکثر طالب علم مالی مسائل کا شکار تھے۔ تعلیمی اخراجات چلانے کے لیے انھیں رات کو اخباروں اور بعض دوسرے اداروں میں نوکریاں کرنی پڑتی تھیں۔ بعض طالب علم ریلوے اور دوسرے محکموں میں ملازمت کرتے اور جز وقتی طور پر حصول تعلیم میں وقت صرف کرتے تھے۔ یہ بھی ہے کہ مرد طالب علموں کی تعداد کالجوں میں کم ہوتی گئی اور بڑھتی ہوئی آبادی میں خواتین کے لیے تعلیم کے مواقع پیدا ہوئے اور اس طرح اعلیٰ تعلیم میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ ہو گئی۔ ان میں ملازمتوں کی طرف بہت کم جاتی تھیں اور جو جاتیں ان کی جب شادی ہو جاتی تو وہ ملازمتیں چھوڑ جاتی تھیں۔

سیاسی حالات نے بھی ملک میں زیادہ افراتفری پیدا کی۔ صدر ایوب خان کے زمانے میں طلبہ میں سیاست کاری اور یونین بازی بڑھی۔ اب سیاسی جماعتوں نے طالب علموں کو سیاسی ورکر بنا کر حصول تعلیم کو ثانوی درجہ دے دیا۔ سیاسی جماعتوں میں حصول اقتدار کی دوڑ شروع ہوئی اور طالب علم بھی سیاست کے راستے پر چل نکلے۔ ہر پارٹی نے اپنے حق میں طالب علموں کو منظم کیا۔ اسی طرح تعلیمی اداروں میں پہلے آہنی مکوں، پھر پستولوں کا چلن ہوا اور بعد میں ادارے کلاشنکوف کلچر کا میدان بن گئے اور آج بھی صورت حال یہی ہے۔ کلاسوں میں سنجیدہ طالب علموں کی تعداد کم سے کم تر ہوتی چلی گئی۔ ذہین طالب علم بھی سیاسی ذریعے سے دولت کے حصول اور اعلیٰ عہدوں کی خواہش میں اپنے اصل راستوں سے دور نکلتے گئے۔ تدریس کے پیشے میں صرف وہی لوگ آئے یا رہ گئے، جنھیں کوئی اور کوچہ میسر نہیں تھا۔

علاوہ ازیں نظام تعلیم میں آئے دن کی ادلا بدلی سے اکھاڑ پچھاڑ کا ایسا عمل پیدا ہوا کہ کوئی تعلیمی پالیسی بھی مستقل طور پر نہیں چل پائی۔ پالیسی سازی اساتذہ کی بجائے بیورو کریٹس کے ہاتھ میں تھی جس سے تعلیمی مسائل اور بھی الجھ کر رہ گئے اور تعلیم کا پیشہ ایک "اچھوت کالونی" بن کر رہ گیا۔

تعلیمی پیشے کی اصلاح اور اسے پرکشش بنانے کے لیے یہ تجاویز کار آمد ہو سکتی ہیں:

۱۔ سیاسی جماعتیں ضابطۂ اخلاق بنائیں کہ وہ طالب علموں اور اساتذہ کو سیاست میں ملوث

نہیں کریں گی۔

۲۔ داخلے کا معیار صرف میرٹ پر ہو۔ دوسرے معیاروں (مثلاً کھیل یا مباحثے کے ذریعے کی بنیاد پر داخلے) سے آنے والے بہت کم صحیح کھلاڑی یا صحیح مقرر ہوتے ہیں۔ عموماً یہ راستہ سیاسی بھرتی کا چور دروازہ بن کر رہ گیا ہے۔

۳۔ اساتذہ کے تعلیمی معیار ہی کو ان کی ملازمت کے لیے معیار تسلیم کیا جائے اور اساتذہ کی سالانہ ترقیوں کو ان کی کلاس کے امتحانی نتائج سے مربوط کیا جائے۔

۴۔ ایڈہاک تعلیمی پالیسیوں کی بجائے بیس سال کی مستقل تعلیمی پالیسی وضع کی جائے۔

۵۔ سمسٹر سسٹم جہاں جہاں بھی رائج ہے اسے ختم کر دیا جائے، کیونکہ یہ سیاسی مقاصد براری کا وسیلہ بن کر رہ گیا ہے۔

۶۔ امتحانوں میں رازداری کو یقینی بنایا جائے اور اس سیکٹر سے رشوت کے قلع قمع کے لیے مناسب اقدامات کیے جائیں، ممتحنوں اور کمرۂ امتحان کے عملے کو پورا پورا تحفظ دیا جائے۔

۷۔ تعلیم کو باوقار بنانے کے لیے تنخواہ کے سکیلوں پر نظرثانی کی جائے۔ نیز اعلیٰ تعلیمی اور تحقیقی سندات رکھنے والے افراد کو ترجیح دے کر اچھے اساتذہ کو اس سیکٹر میں آنے کے لیے آمادہ کیا جائے۔

۸۔ معاشرے کے عام رویے کو بھی ٹھیک کیا جائے، اساتذہ اگر غلط معاشرے میں رہتے ہیں تو وہ نیک کہاں ہو سکتے ہیں۔ سیاسی اور سماجی سطح پر اقدار کی بحالی کے لیے حکومت کو مؤثر اقدامات کرنے چاہئیں، صرف تعلیمی نظام کی بہتری سے پورے معاشرے کا نظام بہتر نہیں ہو سکتا۔

س: ابتدائی تعلیم بنیادی حیثیت رکھتی ہے، لیکن پاکستان میں بنیادی تعلیم کو کوئی زیادہ اہمیت نہیں دی جا رہی۔ اگر آپ اس رائے سے متفق ہیں تو اس کی اصلاح کے لیے کیا اقدامات تجویز فرماتے ہیں؟

ج: یہ درست ہے کہ ابتدائی تعلیم کسی بھی نظام تعلیم میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور پاکستان میں اس سطح پر کوئی خاص توجہ نہیں دی جا رہی۔ ابتدائی تعلیم کا مسئلہ بہت توجہ

چاہتا ہے۔ اس میں ایک تو سرکاری سطح پر اسکولوں کی تعداد بڑھانے کی ضرورت ہے۔

دوسرے بھٹو دور (۱۹۷۱ء-۷۷) سے پہلے کے اس نظام کو بھی رائج کرنا ضروری ہے جسے نیشنل کالجز اور سکولز کا نظام کہا جاتا تھا۔ اس کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ حکومت کی مالی اعانت سے یہ ادارے دوبارہ اپنا فریضہ ادا کر سکیں گے۔ حکومت کا مالی بوجھ کم ہو جائے گا۔ لیکن آج پرائیویٹ سیکٹر میں جو سکول قائم ہو رہے ہیں، ان کا مطمع نظر تجارتی مفادات ہے۔ ابتدائی سطح پر تعلیم کے اس تجارتی رجحان کی روک تھام بھی ضروری ہے۔

ان اسکولوں میں اساتذہ کی بھرتی، مالی وسائل کی فراہمی، تعلیمی ضروریات اور فیسوں وغیرہ کا کوئی کم سے کم معیار تو ہونا چاہیے، نصاب تعلیم اور درسی کتب کے لیے بھی کوئی مقرر ہونی چاہیے، غیر ملکی زبان ذریعہ تعلیم نہیں ہونی چاہیے۔ قومی زبان کو اس کا صحیح مقام دے کر اور مقامی زبانوں کے ساتھ کوئی قابل عمل فارمولا وضع کر کے اس میدان میں تعلیم کو استحکام دینے کی ضرورت ہے۔ تقسیم برصغیر کے وقت ہمارا نظام تعلیم تین طرح کے اداروں کا مجموعہ تھا:

۱۔ اردو ذریعہ تعلیم کے مدرسے، جن میں سرکاری اور غیر سرکاری دونوں طرح کے ادارے شامل تھے۔

۲۔ چیفس کالج اور اس طرح کے دوسرے جاگیرداروں، نوابوں اور سرمایہ داروں کے مدرسے، جن میں انگریزی ذریعہ تعلیم تھی۔

۳۔ مشنری ادارے، جن میں عیسائیت کی مذہبی تعلیم بھی نصاب کا لازمی حصہ تھی۔

پاکستان بننے کے بعد ایسے سکولوں کی جو مختلف اقسام پائی جاتی ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ گورنمنٹ کے سرکاری ادارے

۲۔ غیر ملکی امتحانات دلانے والے ادارے

۳۔ مشنری ادارے

۴۔ دولت مندوں کی تعلیم کے لیے چیفس کالج اور فوجی سکول۔

۵۔ وہ پرائیویٹ ادارے جو انگریزی ذریعہ تعلیم کو اپنائے ہوئے ہیں اور ہزاروں روپے ماہانہ فیسیں لیتے ہیں۔ لیکن ان کے پاس طلبہ کے لیے کھیل کے میدان اور لیبارٹری کی کوئی بنیادی سہولت بھی موجود نہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ نظام تعلیم کو یکساں بنایا جائے۔ پانچ اقسام کے مدرسوں کی بجائے ذریعہ تعلیم سب کا ایک ہی رکھا جائے۔ معیار زندگی اور تعلیم کو بلند اور یکساں رکھنے کے لیے ان مدرسوں کی جانچ پڑتال کا کوئی مستقل نظام وضع کیا جائے۔ ذریعہ تعلیم کا مسئلہ خاص طور پر توجہ طلب ہے۔ انگریزی ذریعہ تعلیم کی وجہ سے ہمارے ہاں ایسے ذہین طالب علم پیدا نہیں ہو سکتے جو قوم کی رہنمائی کر سکیں اور زندگی کے مختلف شعبوں میں وہ کارنامے انجام دے سکیں جو ترقی یافتہ ممالک میں انجام دیے جا رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اساتذہ پیشہ ورانہ تربیت سے بہرہ ور ہوں اور وقتاً فوقتاً ان کے ریفریشر کورسز کا بھی انتظام ہونا چاہیے۔

س: ہم پاکستان میں رہتے ہوئے بھی دوسرے صوبے میں اجنبی معلوم ہونے لگے ہیں۔ آپ کے خیال میں کیا اقدامات ضروری ہیں کہ جن سے بین الصوبائی افہام و تفہیم کے ساتھ پاکستانیات کو فروغ ملے؟

ج: پاکستان میں ایک صوبے کے لوگ اگر دوسرے صوبے کے لیے اجنبی ہو گئے ہیں تو اس کی وجہ سیاسی اور سماجی عدم استحکام، اقتصادی عدم استحکام اور نظریاتی عدم استحکام ہے۔ حکومت ان میدانوں میں استحکام کی مساعی کو مکمل طور پر بروئے کار نہیں لائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صوبائی اور علاقائی عصبیتیں بڑھتی چلی گئیں۔ علاقائی عصبیتوں کے پھیلانے میں خود حکومت کا کردار بھی اہم رہا ہے۔ مقامی کلچر کی حد سے زیادہ حوصلہ افزائی گئی اور اشتراک کے بجائے اختلاف کے عناصر پر زیادہ زور دیا گیا۔ پاکستانیت کے فروغ کے لیے جہاں مذکورہ بالا چار شعبوں میں استحکام پیدا کرنے کی ضرورت ہے، وہاں مذہب اور زبان بھی اشتراک کے اہم وسیلے بن سکتے تھے لیکن ان موخر الذکر دونوں عناصر سے مجرمانہ غفلت برتی گئی، اس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے۔

س: ایک نظریہ یہ ہے کہ تعلیم کے بغیر صحت مند جمہوریت کا قیام اور اس کی نشوونما ناممکن ہے۔ پاکستان کے حوالے کے آپ اس بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟

ج: اس میں شک نہیں کہ صحت مند جمہوریت کے قیام کے لیے معاشرے کے افراد

کا پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے۔ تعلیم کے بغیر افراد نہ تو صحیح نمائندے منتخب کر سکتے ہیں اور نہ ان پڑھ نمائندے جمہوریت ہی کو پروان چڑھا سکتے ہیں۔ دوسرے پہلو پر بھی مختصراً کچھ کہنا چاہوں گا۔ تعلیم میں جمہوری اقدار کی بحالی یقیناً خوش آئند بات ہے، لیکن ہم جمہوریت کے نام پر مادر پدر آزادی ایسے نعروں میں ایسے گھر گئے ہیں کہ اب ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا ہو گا۔

جمہوریت کا بنیادی تقاضا یہ تھا کہ اساتذہ تعلیمی پالیسیاں وضع کرتے، لیکن یہ حق انہیں نہیں دیا گیا۔ اس طرح تعلیم صوبائی موضوع کے ساتھ ساتھ مرکزی موضوع بھی ہے، لیکن جمہوریت کے نام لیوا ان دونوں کے درمیان تقسیم کار کا کوئی فارمولا بھی وضع نہیں کر پائے۔ نتیجہ یہ ہے کہ صوبوں اور مرکز کے درمیان حقوق کی جنگ میں تعلیم کا نظام بھی میدان جنگ بن کر رہ گیا ہے۔ یونیورسٹیوں کا حال یہ ہے کہ جتنی جمہوریت ان میں رائج تھی، وہ بھی ختم کر کے ان کو حکومت کے محکمے بنا دیا گیا ہے۔ جمہوریت کے نام پر سیاسی رہنماؤں اور ارکان اسمبلی کو یونیورسٹیوں کے اندر لا کر بٹھا دیا گیا، جس سے تعلیم میں اور بھی مسائل پیدا ہوئے ہیں۔

چاہیے تو یہ تھا کہ یونیورسٹیوں کے اداروں میں تعلیم کے سیکٹر سے پیشہ ور لوگ جاتے اور اس طرح جمہوریت مستحکم کرنے کا سبب بنتے، لیکن موجودہ صورت میں بعض جمہوری اقدامات سے غیر جمہوری اداروں کی نشوونما کا امکان بڑھ گیا ہے۔

س: پاکستان میں خواتین یونیورسٹی کے قیام کا مطالبہ کافی عرصے سے کیا جا رہا ہے، لیکن تا حال سیاسی بیان بازی کے سوا کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا گیا ہے، آپ کے خیال میں یہ مطالبہ کہاں تک جائز ہے اور اس کی عملی صورت کیا ہو سکتی ہے؟

ج: پاکستان میں خواتین یونیورسٹی کا مطالبہ پہلے مرکزی حکومت سے تھا، لیکن وہاں اس کے کوئی آثار نظر نہیں آئے، لے دے کر یہ اقدام اب صوبائی حکومتوں کی ذمہ داری بن گیا ہے۔ میرے خیال میں خواتین یونیورسٹیوں کے قیام کا مقصد یہ نہیں کہ جس یونیورسٹی میں طالبات لڑکوں کے دوش بدوش تعلیم حاصل کر رہی ہیں، انہیں ایسا کرنے سے روک دیا جائے۔ بلکہ اس کا مقصد یہ ہے جو طالبات مخلوط تعلیم میں رہنا پسند نہیں کرتیں، انہیں

جداگانہ طور پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا حق دیا جائے۔

دوسرے صوبوں کا حال مجھے معلوم نہیں، لیکن صوبہ پنجاب میں خواتین کی ایک بہت بڑی آبادی ایسی ہے کہ طالبات، لڑکیوں کے کالجوں میں تعلیم حاصل کرتی ہیں اور اعلیٰ تعلیم کے لیے مردانہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل نہیں کرنا چاہتیں، اور اسی لیے وہ اکثر تعلیم سے محروم رہ جاتی ہیں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ حکومت ایسی خواتین کے لیے بھی ایک یا کئی یونیورسٹیاں قائم کرے، کیونکہ تعلیم یافتہ لڑکیوں کی آبادی اب اتنی بڑھ چکی ہے کہ خود صوبہ پنجاب میں خواتین کی کم از کم دو یونیورسٹیاں قائم کی جا سکتی ہیں، ایک خواتین کی میڈیکل یونیورسٹی اور دوسری خواتین کی عمومی یونیورسٹی۔ لڑکیوں کے کالجوں کا الحاق بھی ان یونیورسٹیوں کے ساتھ کر دینا چاہیے، تاکہ پنجاب یونیورسٹی پر جو بوجھ اور دباؤ ہے، وہ کم ہو جائے اور وہ اپنے نظم و نسق کو بہتر طور پر چلا سکے۔

س: تعلیم کا موجودہ نظام بے ہنر افراد پیدا کر رہا ہے، جس کے نتیجے میں بے روزگاری کا مسئلہ شدید صورت اختیار کر گیا ہے۔ آپ کے خیال میں نظام تعلیم کی کن خطوط پر منصوبہ بندی ہونی چاہیے تاکہ بے روزگاری کا مسئلہ پیدا نہ ہو

ج: تعلیم کا موجودہ نظام بے ہنر لوگ پیدا کر رہا ہے، یہ آپ کا خیال ہے، میرا نہیں۔ خرابی یوں پیدا ہوتی ہے کہ برطانوی دور کے تسلسل میں تعلیم محض سرکاری ملازمت کے حصول کا ذریعہ تصور کی گئی ہے۔ آج کل ہمارے ہاں تعلیم کا مقصد بھی بالعموم حصول ملازمت ہی ہے۔ یہ مقصد صحیح نہیں، کیونکہ تعلیم تو انسان کو انسان بناتی ہے۔

ہم نے تعلیم کو وسیلہ ملازمت بنا رکھا ہے، اگر یہ مقصد بھی ہو تو پھر سرکاری ملازمت کے علاوہ کئی دوسرے پیشے اور تجارت کے شعبے ایسے موجود ہیں جن کی طرف طالب علموں کو رجوع کرنا چاہیے تھا، فنی تعلیم، کیمیکل، ٹیکنالوجی، انجینئرنگ، فارمیسی، کیمسٹری اور کامرس وغیرہ ایسے شعبے ہیں جن میں موجودہ نظام تعلیم موثر کردار ادا کر سکتا ہے، بشرطیکہ طالب علم کے دل سے سرکاری ملازمت کی ہوس کو نکالا جا سکے اور اسے نجی شعبہ میں کام کرنے پر آمادہ کیا جا سکے۔

میں اس کا حامی نہیں ہوں کہ صرف پیشہ وارانہ تعلیم ہی دی جائے۔ میرے نزدیک

سماجی علوم اور زبانیں، تشکیل کردار کے لیے تعلیم میں اہم کردار ادا کرتی ہیں کہ یہ بالواسطہ طور پر طالب علموں کو ذہنی پختگی کی طرف لے جاتی ہیں اور انھیں پاکستان کا مہذب شہری بنا سکتی ہیں۔ اس کے نتائج آہستہ آہستہ معاشرے میں نمودار ہوتے ہیں اور دور رس ہوتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم نفع پسندی کے پابند ہو گئے ہیں، اور ہمیں صرف وہی علم اچھا لگتا ہے جو فوری طور پر کوئی نہ کوئی روزگار فراہم کر سکے۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ ہر باپ اپنی اولاد کو ڈاکٹر بنانے کے پیچھے لگا ہوا ہے یا انجنیئر یا ایم بی اے ہی میں سب اپنی اولاد کو کھپانا چاہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان ہی سیکٹروں میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کی کثیر تعداد بے روزگاری کا شکار ہو گئی ہے۔ اسی لیے تو اب روز روز انجنیئر اور ڈاکٹر حصول ملازمت کے لیے سڑکوں پر نکل آتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت اعلیٰ سطح کی تعلیم میں منصوبہ بندی کرے اور یونیورسٹیوں کو بتائے کہ ہر سال خاص خاص سیکٹر میں کتنے کتنے آدمیوں کی ضرورت پیش ہو گی، تاکہ ان یونیورسٹیوں میں اتنے طالب علموں کو داخلہ ملے جس کی سرکاری یا پرائیویٹ سیکٹر میں کھپت ممکن ہو، باقی افرادی قوت کے لیے دوسرے راستے دریافت کیے جائیں۔

یاد رہے کہ میں اعلیٰ سطح کی تعلیم محدود رکھنے کے حق میں نہیں ہوں، لیکن اس کے حق میں ہوں کہ سارا کام حسن تنظیم اور مربوط منصوبہ بندی کے تحت ہو، تاکہ وہ بے دلی جو تعلیم یافتہ طبقے میں پیدا ہو رہی ہے، اس کا علاج ہو سکے۔ میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں ضلع کونسلیں اور میونسپلٹیاں اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔ وہ پیشہ وارانہ ادارے قائم کریں جن میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی کھپت ہو اور انھیں ان کی تعلیم کے مطابق تنخواہ بھی دی جائے۔ اسی طرح بڑے بڑے کارخانوں اور فیکٹریوں کے لیے بھی لازم ہو کہ وہ نچلی سطح کی پیشہ وارانہ تعلیم کے لیے اپنے اپنے اسکول قائم کریں اور عام اسکولوں کے بوجھ کو اس طرح کم کریں۔ یہ تو ابتدائی پیشہ وارانہ تعلیم کی بات تھی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے یہی ادارے یونیورسٹیوں سے تعاون کریں اور انھیں وسائل مہیا کریں اور ذمہ داری بھی لیں کہ طلبہ کی خاص تعداد کو اپنے اپنے اداروں میں ملازمت بھی فراہم کریں گے۔

فی الحال اعلیٰ تعلیم پوری کی پوری پرائیویٹ سیکٹر کے حوالے نہیں کی جا سکتی (انجمن حمایت اسلام اس سے مستثنیٰ ہے) ہمارے ہاں سرمایہ داروں اور بڑے بڑے

جاگیرداروں میں تعلیم کی حوصلہ افزائی کے لیے یونیورسٹیوں کو عطیات دینے کی عادت نہیں رہی، اس لیے اس نظام کو فی الحال حکومت کے تحت ہی چلنا چاہیے۔ اس کے علاوہ یونیورسٹیوں کو اپنے مالی وسائل دریافت کرنے کی اجازت ہونی چاہیے اور حوصلہ افزائی بھی ہونی چاہیے تاکہ حکومت کے خزانے پر دباؤ کم سے کم ہوسکے۔

ایک خاص حد سے زیادہ دولت کمانے والے تاجروں، کارخانہ داروں اور زمیں داروں کو پابند کیا جائے کہ وہ اپنی آمدنی کا کم از کم پچیس فی صد حصہ ان یونیورسٹیوں کو گرانٹ کی صورت میں ادا کریں۔ اسی نسبت سے انھیں انکم ٹیکس کی چھوٹ دی جاسکتی ہے۔ اگر زراعت پر بھی ٹیکس نافذ ہوجائے تو زرعی ٹیکس میں بھی اداروں کی مالی اعانت پر اسی نسبت سے ٹیکس کی چھوٹ دے دی جائے۔ تجارتی ادارے اپنی اشتہار بازی میں جو رقم لگاتے ہیں وہ ٹیکس فری ہوتی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس رقم کا ایک حصہ تعلیم کے لیے مخصوص کردیا جائے۔ اس سے حکومت پر بوجھ کم ہوجائے گا، اور وہ نظام تعلیم کو کامیاب بنانے کے لیے بہتر مالی وسائل حاصل کرسکے گی۔ اس طرح حصول روزگار بھی آسان ہوجائے گا۔

س: پاکستان میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ طلبہ کا بیشتر وقت امتحانات کے التوا یا نتائج کے انتظار میں گزر جاتا ہے۔ آپ اسے معیار تعلیم کے گرنے میں کیا جگہ دیتے ہیں؟

ج: یہ خیال صحیح ہے کہ پاکستان میں آئے روز امتحانوں کے التوا اور نتائج کا انتظار، معیار تعلیم کے گرنے کے اسباب میں شامل ہیں۔ لیکن یہ واحد سبب نہیں۔ ضرورت ہے کہ امتحانات اور ان کے نتائج کو باقاعدہ بنایا جائے اور جو طلبہ امتحانات ملتوی کرانے کے لیے ایجی ٹیشن کرتے ہیں یا امتحانی مراکز پر حملہ آور ہوتے ہیں انھیں اگر قرار واقعی سزا مل سکے تو اس سے بھی نظام تعلیم میں استحکام پیدا ہوگا۔ حکومتیں عام طور پر یہ سمجھتی ہیں کہ جہاں کسی طالب علم نے شورش نہ کی، وہاں پرنسپل یا وائس چانسلر دونوں کامیاب ہیں۔ حالانکہ صورت حال یہ نہیں ہوتی۔ اداروں کے سربراہ اخباروں میں اپنی لابیاں رکھتے ہیں تاکہ ان اداروں کی خبر اخبارات میں نہ جائے۔

وائس چانسلر، سی آئی ڈی اور پولیس کی دوسری خفیہ ایجنسیوں سے تعلقات بنا کر رکھتے ہیں، تاکہ اوپر سب ٹھیک ہے کی رپورٹ جائے، طالب علموں کو سیاسی رشوت دے کر یا ان

کے ناجائز مطالبات مان کر، نیز امتحان کے التوا کے لیے ان کے مطالبات تسلیم کر کے امتحانات ملتوی کر دیتے ہیں۔ ان اقدامات سے یونیورسٹیوں میں بظاہر سناٹا رہتا ہے لیکن تعلیمی معیار گرتا رہتا ہے۔ اساتذہ کی یونینیں اور انتظامی عملے کی یونینیں بھی جداگانہ پریشر گروپ ہیں۔ اداروں کے سربراہوں کو ان یونینیوں یا ان کے لیڈروں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

اس کے علاج کے سلسلے میں یہ اقدامات کیے جا سکتے ہیں:

۱- پرائمری سطح سے ہی امتحانوں میں رازداری کا نظام قائم کیا جائے اور اس پر سختی سے عمل کیا جائے۔

۲- کسی استاد کے پاس ایک وقت میں مجموعی طور پر تین سو سے زیادہ جوابی کاپیاں نہ بھیجی جائیں، تاکہ وہ بروقت نتائج دے سکے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ استاد بیک وقت پرائمری، مڈل، میٹرک، ایف اے، بی اے، حتیٰ کہ ایم اے تک کے امتحانات کا ممتحن ہوتا ہے۔ اگر یہ امتحانات تین تین ماہ کے وقفے سے ہوں تو پھر بیک وقت دو یا تین امتحانوں کی کاپیاں جانچنے کی نوبت نہیں آئے گی اور اس طرح نتیجہ جلد نکل سکے گا۔

۳- طلبہ اور یونینوں کے ناجائز مطالبات تسلیم نہ کیے جائیں اور انھیں سیاست سے باز رکھنے کے ساتھ ساتھ علم و ادب دوست بنایا جائے۔

۴- اس مقصد کے لیے کوئی مستقل نظام وضع ہونا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ یونیورسٹی کی سطح پر اس کا علاج آسان ہے کیونکہ یونیورسٹیوں کے سنڈیکیٹ میں اکثر جج شامل ہوتے ہیں۔ ان ججوں کو مطالبات کی چھان پھٹک اور آخری فیصلے کا اختیار ہونا چاہیے، کیونکہ جائز یا ناجائز ہونے کا فیصلہ قانون سے آگاہ لوگ بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔

س: کیا وجہ ہے کہ ہمارا نظامِ تعلیم اچھے مفکر، مورخ، محقق اور دانش ور پیدا نہیں کر رہا۔ اس حوالے سے آپ نظامِ تعلیم کی اصلاح کے سلسلے میں کیا تجاویز پیش فرمائیں گے؟

ج: یہ درست ہے کہ ہمارا نظامِ تعلیم اچھے مفکر، مورخ، محقق اور دانش ور پیدا نہیں کر رہا۔ اس کی کئی وجوہ ہیں، مثال کے طور پر:

ا۔ ہمارا نظام تعلیم مسلسل تجربات کی آماجگاہ رہا ہے، ایڈہاک تجربے اور ایڈہاک فیصلے اس نظام کو خراب کرتے آئے ہیں۔

ب۔ معاشرہ خراب ہے تو صرف نظام تعلیم مذکورہ بالا اعلیٰ درجے کے شہری کیسے مہیا کر سکتا ہے، ملک کی عمومی حالت بہتر ہو گی تو نظام تعلیم اس درجے پر آجائے گا جس درجے پر تقسیم سے پہلے تھا، اور ویسے ہی مفکر، مؤرخ، محقق اور اچھے سائنس دان پیدا کرنے لگے گا، جیسے تقسیم سے پہلے کر رہا تھا۔

ج۔ اگر نظام تعلیم کے بارے میں حکومت سنجیدہ ہو تو پہلے مذکورہ بالا امور کے علاوہ سارے ملک میں یکساں نظام تعلیم رائج کرے اور ایک ہی ذریعہ تعلیم بھی اختیار کرے۔ موجودہ روش کے تحت ممکن ہے کہ ہم اچھے استاد اور اچھے تاریخ کے طالب علم تو پیدا کر لیں، لیکن اچھے سائنسدان، اچھے مؤرخ اور اچھے دانش دو پیدا نہیں کر سکیں گے، اس لیے ضروری ہے کہ:

ا۔ ابتدائی تعلیم (پہلی جماعت سے تیسری تک) صوبائی زبانوں میں ہو بشرطیکہ ہر صوبہ صرف ایک ہی زبان ابتدائی سطح پر اختیار کرے، ورنہ قومی زبان قابل ترجیح ہے۔

۲۔ چوتھی جماعت سے ایف اے تک اردو کو لازمی مضمون کے طور پڑھایا جائے، جو فنکشنل اردو کہلائے اور اس کا نظام اور نصاب ادبیات کی بجائے زبان سے متعلق ہو اور باقی جملہ مضامین (بشمول سائنس) اردو ذریعہ تعلیم کے وسیلے سے پڑھائے جائیں۔ ان کی درسی کتابیں بھی اردو میں ہوں اور ان کا ذریعہ امتحان بھی اردو ہو۔

۳۔ چھٹی جماعت سے لے کر گریجویشن تک انگریزی کو لازمی ثانوی زبان کا درجہ دیا جائے اور اس مضمون میں ادب کی بجائے کاروباری یا فنکشنل انگریزی کی تدریس کی جائے۔ بی اے/ بی ایس سی سے لے کر ایم اے/ ایم ایس سی اور پی ایچ ڈی تک پاکستان میں قومی زبان ذریعہ تدریس اور ذریعہ امتحان ہونی چاہیے۔ اسی طرح مقابلے کے امتحانوں میں بھی اس زبان کے استعمال کی اجازت ہونی چاہیے جو یونیورسٹیوں میں ذریعہ تعلیم ہو۔

س: پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے۔ لیکن بعض اوقات برسر اقتدار حکومت بعض

غیر نظریاتی عناصر کو ثقافت میں شامل کر لیتی ہے۔ آپ کے نزدیک اس کا کہاں تک جواز ہے؟ آپ کے خیال میں کیا اقدام کرنا چاہیے کہ کوئی بھی حکومت آئے مگر پاکستان کی نشوونما اور ترقی رکنے نہ پائے؟

ج: اس کا جواب تو برسر اقتدار حکومت ہی دے سکتی ہے کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہے۔ ثقافتی ادارے اور ان کی نشوونما کسی طرح اگر پبلک سیکٹر کے حوالے کی جا سکے تو علاج ممکن ہے۔ پبلک سیکٹر سے مراد سٹیٹ سیکٹر نہیں ہے۔ اگر آپ ثقافت کو ڈپٹی کمشنروں کے حوالے کرتے ہیں تو پھر اس کا کوئی مداوا ممکن نہیں ہے۔ جمہوری ملک میں ہر حکومت پابند ہوتی ہے کہ عوامی دباؤ کے تحت اپنا کردار درست رکھے، مگر اس کے لیے رائے عامہ کی بیداری شرط ہے۔ جو تعلیم کے بغیر ممکن نہیں۔ فی الوقت پاکستان میں حکومتی اعداد و شمار کے مطابق خواندگی کی شرح ۲۶ فی صد ہے جو دراصل ۱۲ فی صد سے زیادہ نہیں۔ دیہات میں ۷۰ فی صد افراد بستے ہیں اور وہاں خواندگی کا تناسب اور بھی کم ہے۔

آپ کے سوال کا مطلب تو یہ ہے کہ ہم عوامی سطح پر اس کا کوئی شعور پیدا نہیں کر پائے، جو حکومت کو سیدھا کر سکے۔ ایک ثقافت ہی کی کیا بات ہے، دوسرے سیکٹروں میں بھی یہی حال ہے۔ ہمارے ملک میں مارشل لا نجات دہندہ بن کر آتا ہے اور بالآخر خود آمر بن بیٹھتا ہے۔ حکومتیں جمہوریت کے بل بوتے پر برسر اقتدار آتی ہیں اور خود بالآخر آمریت کا روپ دھار لیتی ہیں۔ بنیادی خرابی تو ہمارے معاشرے، ہمارے سماجی شعور، ہماری تعلیمی پسماندگی اور ہماری غلط لیڈر شپ کی ہے۔ جس کی سزا ساری قوم بھگت رہی ہے۔ حالات زیادہ سنگین ہوں تو اس کا مداوا کسی بڑے آپریشن کے بغیر ممکن نہیں۔

س: ڈاکٹر صاحب، آپ کے خیال میں نظریۂ پاکستان سے کیا مراد ہے؟ نیز طلبہ کے ذہنوں میں نظریۂ پاکستان راسخ کرنے کے لیے کیا اقدامات ضروری ہے؟

ج: نظریۂ پاکستان کے بارے میں جو انتشار دکھائی دیتا ہے وہ مفاد پرست طبقوں کا پیدا کردہ ہے۔ نظریۂ پاکستان واضح ہے لیکن ہم اس کو اس کے عملی نفاذ کے بجائے اسے زبانی جمع خرچ کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

س: اس وقت لسانی تعصب کو ابھار کر بعض صوبوں میں لسانی بنیادوں پر علاقہ بندی کے مسائل کھڑے کیے جا رہے ہیں، اس کا سد باب کیوں ضروری ہے اور کس طرح ہو سکتا ہے؟

ج: لسانی تعصبات کو ختم کرنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ:

۱۔ نظریہ پاکستان کے لیے رائے عامہ ہموار کی جائے۔

۲۔ تعلیمی نصاب سے علاقائی تشخص کے وہ تمام مضامین خارج کیے جائیں جو مجموعی طور پر پاکستانی تشخص کی نفی کرتے ہیں۔ اس میں علاقائی موضوعات کے ان پہلوؤں کو زیادہ نمایاں کیا جائے جو سب صوبوں اور سب علاقوں میں مشترک ہوں اور ان سے گریز کیا جائے جو علاقائی تعصبات کو بالواسطہ ابھارنے کا سبب بنتے ہیں۔

۳۔ علاقائی زبانوں کو "پوجا" کی چیز بنا کر نہ پیش کیا جائے۔ بلکہ انھیں بھی دوسری زبانوں کے ساتھ ذریعہ اظہار کا ایک نارمل وسیلہ بنا کر پیش کیا جائے۔

۴۔ لسانی فارمولا وضع کیا جائے کہ کس سطح تک صوبائی زبانیں ذریعہ تعلیم بنائی جائیں ہم قومی زبان کی تعلیم اور قومی زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر اپنانا کس درجے سے شروع کریں گے؟ یہ بھی ضروری ہے کہ سب صوبوں میں اس فارمولے کو یکساں طور پر اختیار کیا جائے۔

۵۔ صوبوں کی پسماندگی کے مسئلے کو فروغ شعور کے ذریعے دور کیا جائے، صوبوں کی محرومیوں کا علاج مرحلہ وار کیا جائے، فوری اقدامات اور فوری نتائج کی توقع سے حالات اور الجھ جائیں گے۔

ایک آدھ سال کے اندر اندر چھوٹے صوبوں ہی کو زیادہ تر ملازمتیں دی گئیں تو اس سے بڑے صوبوں میں بھی احساس محرومی پیدا ہونے لگے گا۔ میرے نزدیک اس کا بہترین جمہوری حل یہ ہے کہ آبادی کے اعتبار سے صوبائی حصے مقرر کر دیے جائیں۔ اگر ہم جمہوریت کے واقعی علمبردار ہیں تو کیوں نہ ہم عہد کریں کہ ہم آبادی کے تناسب سے آئندہ اپنے سماجی مسائل حل کریں گے۔ جو صوبے پسماندہ ہیں، انھیں زیادہ گرانٹ دے کر ترقی یافتہ صوبوں کی سطح پر لایا جائے اور یہ عمل بھی تدریجی ہو۔ ہر صوبے میں بعض اضلاع پسماندہ ہیں، ان کی طرف بھی توجہ دی جائے۔ جب پسماندگی دور ہو جائے تو پھر بجٹ کو

آبادی کے تناسب سے جمہوری طریق کار اختیار کرتے ہوئے تقسیم کر دیا جائے۔

س: آج کے طلبہ کے ہاتھ میں کتاب کی بجائے کلاشنکوف ہے، آپ کے خیال میں اس کا سدباب کس طرح ممکن ہے؟

ج: یہ مسئلہ سیاسی ہے۔ سیاسی پارٹیاں اور حکومتیں اس بارے میں دیانت دار ہوں اور طالب علم صرف تعلیم سے سروکار رکھیں تو یہ مسئلہ بخوبی حل ہو سکتا ہے۔ کسی ایک ہوسٹل یا ایک کالج یا ایک یونیورسٹی کی تلاشی لینے سے بات نہیں بنتی، کیونکہ باہر سے اسلحہ بہت زیادہ آ رہا ہے۔ حکومت اگر سرحدوں پر روک تھام کر سکتی ہے تو پھر کلاشنکوف تعلیمی اداروں میں پہنچنے سے رک جائے گی۔ ورنہ صورت حال اس سے بھی خراب تر ہو سکتی ہے۔

س: ڈاکٹر صاحب، آج کل امتحانات میں نقل کا رحجان عام ہے، آپ اس کے اسباب اور علاج کے بارے میں کیا کہنا پسند فرمائیں گے؟

ج: نقل کے اسباب کئی ہیں، جن کی تفصیل میں جائے بغیر میں مختصراً یوں کہوں گا:

ا- ڈگری ذریعہ ملازمت بن گئی ہے اور بعض افراد کو صوبائی کوٹے سے باآسانی حصہ مل جاتا ہے۔ باقی افراد بھی مراعات بزور حاصل کرنا چاہتے ہیں اندریں حالات طالب علم کلاشنکوف اور نقل کے ذریعے بہر قیمت اپنا حصہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

ب- غیر ممالک میں حصول تعلیم کی خواہش بھی اہم عنصر ہے، جو مالدار طالب علموں کو مجبور کرتی ہے کہ دولت کے زور پر نقل لگا کر ڈگری حاصل کریں، تاکہ بیرون ملک جائیں اور وہاں تعلیم یا روزگار حاصل کر سکیں۔

ج- طالب علموں کی تعداد زیادہ ہو گئی ہے۔ داخلے کا مسئلہ ہے۔

د- پیشہ ورانہ تعلیم میں داخلے کا حصول خاصا مشکل ہوتا ہے۔ امرا امریکہ اور برطانیہ میں اولاد کو بھیجنے کے لیے جعلی ڈگریاں چاہتے ہیں، جبکہ غریب لوگ، عرب ممالک میں چھوٹی ملازمتیں حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ دونوں کے لیے ڈگریاں اور ڈپلومے ہی کام آ سکتے ہیں۔ مارکیٹ میں جعلی ڈگریاں بھی ملتی ہیں۔ اصلی ڈگریوں کے لیے بھی نقل لگا کر کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔

ہ- معاشرے کے سارے شعبے اخلاقی قدروں سے عاری ہو چکے ہیں۔ سارے معاشرے

میں جب دھونس دھاندلی اور رشوت کا زور ہو گا تو تعلیمی حلقہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ علاج کے لیے میری تجویز ہے کہ معاشرے کی اصلاح فرد کی سطح سے حکومتی اداروں تک ہو اور حکومت بحیثیت مجموعی اخلاقی اقدار کی بحالی کے لیے مناسب اقدامات کرے۔ اگر رشوت دے کر ووٹ حاصل کیے جائیں گے اور عوام کے ووٹ خریدے جائیں گے تو معاشرے کی اصلاح کے تمام دعوے غلط ہوں گے۔ ہر گھر سے اصلاح شروع ہو تو صورت حال بہتر ہو سکتی ہے اور نقل بھی رک سکتی ہے۔ اب یہ سوچنا حکومت کا کام ہے۔ صوبائی اور مرکزی حکومتیں عہد کریں کہ وہ اس طرح کے ذرائع کام میں نہیں لائیں گی اور نہ دوسروں کو لانے دیں گی۔ ورنہ یاد رہے کہ عام آدمی مہنگائی کے ہاتھوں اتنا تنگ آچکا ہے کہ ہو سکتا ہے کسی وقت لاوا اُبل پڑے اور سب کچھ بہا کر لے جائے۔

ڈاکٹر وحید قریشی (۱۴ فروری ۱۹۲۵ء، میانوالی۔ آبائی وطن گوجرانوالہ) ثانوی درجے تک اسلامیہ ہائی اسکول، بھاٹی گیٹ، لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے آنرز (فارسی) کیا۔ ۱۹۴۶ء میں ایم اے فارسی اور پھر تاریخ میں ایم اے کے علاوہ فارسی میں ڈاکٹریٹ (۱۹۵۲ء) کی ڈگری لی۔ اس کے بعد ۱۹۶۵ء میں اسی دانش گاہ نے آپ کو اردو ادب میں ڈاکٹر آف لٹریچر (ڈی لٹ) کی سند فضیلت عطا کی پیشہ تدریس سے منسلک رہے۔ ۱۹۵۱ء میں اسلامیہ کالج سے وابستہ ہوئے۔ ۱۹۶۲ء میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں آ گئے اور ۱۹۷۵ء میں غالب پروفیسر کا اعزاز حاصل کیا۔ یونیورسٹی میں بطور پرنسپل اورینٹل کالج، صدر شعبہ اردو، چیئرمین شعبہ پنجابی، اور ڈین فیکلٹی آف اسلامک اینڈ اورینٹل لرننگ خدمات انجام دیں۔ ۱۹۸۳ء میں مقتدرہ قومی زبان، پاکستان کے چیئرمین مقرر ہوئے، جہاں ۱۹۸۷ء تک ذمہ داری ادا کی۔ پھر بزم اقبال کے سیکرٹری (۱۹۸۷ء تا ۱۹۹۳ء) ور ڈائریکٹر اقبال اکادمی (۱۹۹۳ء۔ ۱۹۹۷ء) کی حیثیت سے قابل قدر کارنامے انجام دیئے۔ ۱۹۹۳ء میں انھیں حکومت پاکستان کی طرف سے ادبیات کا صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی عطا کیا گیا۔ تاریخ، ادب، اردو، پنجابی، ابلاغیات اور فارسی میں کم و بیش ۸۱ کتابوں کے مصنف و مرتب ہیں۔

○

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد ایک آزاد تحقیقی ادارہ ہے۔ جہاں پر عالم اسلام سے متعلق بالعموم اور پاکستان کے بارے میں بالخصوص، سماجی، معاشی، تعلیمی، دفاعی اور بین الاقوامی پالیسی امور کا تحقیقی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے عملی اور اطلاقی پہلوؤں کو خاص طور پر مطالعے کا موضوع بنایا جاتا ہے۔ معاشرے کے تمام نمائندہ نقطہ ہائے نظر کو سنجیدگی سے پرکھا اور پیش کیا جاتا ہے۔ اب تک انسٹی ٹیوٹ کی دو سو سے زائد مطبوعات، پالیسی ساز اداروں اور تحقیق کاروں کی جانب سے داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ اس وقت انسٹی ٹیوٹ کے چھ جرائد باقاعدگی سے شائع ہو رہے ہیں، جبکہ معاشیات، تعلیم، امور خارجہ، سماجیات اور کشمیر پر اسٹڈی گروپ بڑی تندہی سے اپنے دائرہ کار میں تحقیق، تجزیہ اور تحریر کا کام کر رہے ہیں۔

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد